

میراجی
کی
نظمیں

میراجی کی نظمیں

ناشر

ساقی بک ڈپو دہلی

قیمت دو روپے آٹھ آنے

(طبع اول)

(مطبوعہ جہاں برقی پریس دہلی)

فہرست

دِلّی کے نام

جو مِٹ سکتی ہے، مر نہیں سکتی۔

دیباچہ

میں کہتا ہوں اجالے کو کون پسند نہیں کرتا جب سے یہ دنیا بنی ہے جب سے آدم کی اولاد اپنے جدِ امجد کے گناہ کی پاداش میں کرۂ ارضی پر رہنے لگی ہے۔ جب سے بندر پیڑ کی ٹہنیوں سے اتر کر زمین پر چلنے پھرنے لگا ہے۔ اُجالے اور اندھیرے کی کشمکش جاری ہے۔ اور انسانی فطرت ہمیشہ اُجالے ہی کو ترجیح دیتی رہی ہے یہاں تک کہ ہماری نظر میں نیکی بدی رنج و راحت ــــ زندگی کی ہر قدر دن اور رات کی گردش سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے نور اور تاریکی ہی کا پَرتو بن گئی ہے مگر اس کے باوجود ہم گذرے ہوئے زمانے کے خیالوں میں لذت حاصل کرتے ہیں۔ گذرا ہوا زمانہ ماضی ــــ جو ایک دھندلکا ہے۔ ایک ایسا دھندلکا جو انفرادیت کے دائرے سے آگے بڑھ کر تیرگی کا ایک گہرا عکس بن جاتا ہے۔ ہاں اور اس کے باوجود ہم آنے والے زمانے ہی کے خواب دیکھتے ہیں۔ آنے والا زمانہ ــــ مستقبل ــــ جو صرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ شاید ہم حال کے اُجالے میں اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتے۔ اور اپنے آپ کو دیکھے بغیر ہمیں اطمینان بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم ماضی اور مستقبل میں اپنی ہی ایک غیر مرئی ہستی کو جاننے کی جستجو کرتے ہیں۔ اور اس جستجو کو کامیاب بنانے کے لئے ہمیں مختلف ذرائع سوجھتے ہیں۔ اور ہر ذریعے کے انتخاب میں اپنے ذہنی افق کی حد بندی ہماری

مدد کرتی ہے مجھے اس سلسلے میں اپنے ذہنی افق پر نظمیں دکھائی دیں جنہیں آج یک جا صورت میں آپکے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ میری نظر میں یہ نظمیں اپنی ہستی کا عریاں اظہار ہیں یعنی اپنی شخصیت اور انفرادی ذہانت کا اجالا ہی اجالا ہیں جن کے لئے کسی دالتو اُجالے کی ضرورت نہیں۔ اور اس لئے میں نے سوچا تھا کہ اپنے پہلے مجموعے کو دیباچے کے بغیر ہی شائع کر دوں۔ کیونکہ اگر یہ نظمیں بلکہ ان میں سے ہر نظم بنفسہ اپنی اشاعت کے جواز کی واضح دلیل نہیں ہے تو کسی قسم کا دیباچہ یا مقدمہ ان کی مدد سے عاجز ہوگا (اور پھر وہ بھی میرے قلم سے)۔ دوسرے دیباچے کی حیثیت تو میری نظر میں ایسی ہے جیسے کسی عورت کے چہرے پر نقاب۔ اور ان نظموں کا یہ حال ہے کہ ان میں جگہ جگہ باقی لباس کی موجودگی بھی مشکوک نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جسم پر نقاب بے معنی معلوم ہوئی۔ مگر ـــــ مگر ـــــ یہ مگر بھی عجیب لفظ ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ بڑھتی ہوئی زندگی کی علامت ہے۔ جہاں ایک فقرے کی ہستی معدوم ہونے لگے یہ ایک مختصر سا لفظ اسے موت سے بچا کر آگے بڑھا دیتا ہے۔ شاید اس دیباچے کی تحریر میں بھی اسی مگر کی تحریک کو دخل تھا کہ وہ زندگی جو ان نظموں کے جال میں گرفتار ہو ان ہی تک ختم نہ ہو جائے بلکہ اس کتاب کے افق پر وہ اس دیباچے کی حد تک مستزاد دسترس حاصل کر لے۔ مجھے بڑھتی ہوئی زندگی پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ مکان و زمان کی بے پایاں وسعتوں میں زندگی ہی اہم ترین حقیقت ہے۔ اور اگر میں عورت ہوتا تو اس کا عملی ثبوت دینے میں بھی مجھے ایک گہری لذت حاصل ہوتی۔ مگر ـــــ فی الحال مجبوراً یہ دیباچہ حاضر ہے۔

حال کی حقیقت ایک کھلے میدان کی سی ہے جس میں ہم کھڑے ہیں۔ اور جس کے دوسرے کنارے پر ہمیں ماضی کا ایوان دکھائی دے رہا ہے۔ ایک زرنگار محل جس کی

خوشیوں کا عکس ہمیں ہر سانس کی تلخی کے ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ گزری ہوئی زندگی نسبتاً زیادہ مسرت کی حامل ہوتی ہے یا حال کی زندگی۔ اس سے اس وقت بحث نہیں ہے لیکن ماضی کے ایک محل کی کنجی ہماری ذات کے بہت سے مسائل کو سلجھا سکتی ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے اپنی شخصیت کی نشو و نما کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے میں ماضی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

میرے آبا و اجداد —— آریہ نسل کے انسان تھے۔ وہ آریہ جو وسط ایشیا سے چل کر جب جنوب کی طرف روانہ ہوئے تو ان کا سفر کہیں رکنے ہی میں نہ آتا تھا۔ انہیں کی ذہنیت انہیں کا حافظہ انہیں کی طبیعت نسل در نسل مجھ تک پہنچی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میرا ذہنی سفر بھی پنجاب سے جنوب کی طرف ہی رہا ہے۔ اور شاید اپنی خود کام ذہنیت کی کج روی تھی جو لذت کے آسودہ احساس کو جنوب کی بجائے جنوب مشرق کی طرف لے گئی۔ مگر میرے آبا و اجداد نے جنوب کی طرف جب بھی قدم بڑھایا فتح پائی۔ زمین پر نہ مردوں پر، عورتوں پر۔ اور میں نے ایک ہی بار مشرقی ہندوستان کی ایک عشرت انگیز عورت کی طرف توجہ کی اور ہزیمت کا منہ دیکھا۔ یہی ہزیمت نسلی یادوں کے ساتھ مل کر اس کشمکش کا موجب بنی جس نے مجھے اپنا نام دیا اور اپنا کام سمجھایا اور میں نے دیکھا کہ میں ایک شاعر ہوں۔ لیکن جیسے کہ ایک مغربی سیاح نے لکھا ہے۔

بنگال میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں وہاں سے لوٹ کر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ میں نے بھی اپنے سفر میں اس تلخ حقیقت کو محسوس کیا۔ اور آج ذہنی "تلخی" کو کم کرنے کے لئے اور اپنی شکست کے احساس سے رہائی حاصل کرنے کے

نے بھی میرا ذہن اپنی اونچی تخلیقات میں مجھے بار بار اپنے ہندوستان کی طرف
لے جاتا ہے۔ مجھے آرٹسٹ کبیر اور ہندوستان کی گہرائیوں کا احساس دے کر وہ شعور
بہت پیاری بنا دیتا ہے۔ میرا ہندوستان میری حیات نفسی میں وقت کا
وہ دور ہے جس میں بہت بڑوں سے جنوب اور مشرق پر ہمیشہ فتح پائی۔
لیکن میں نے ملک کی موجودہ سیاست کا ایک جیتا جاگتا فرد بھی ہوں۔ میری
خواہشات بھی ہیں۔ حال کی تاریخ میں میرا دل اپنی فضا میں سانس
لیتا ہے۔ اگرچہ میری آنکھیں ہے آس پاس اپنے سامنے دیکھتی ہیں۔ وہ اس
مشاہدے کا حسن بھی میری نظموں میں جگہ موجود ہے۔ بلکہ وقت کے گذرنے
اور ذہنی نشوونما کے ارتقائی مراحل کے ساتھ ساتھ مشاہدے کی شدت کم
ہے کہ مجھے زندگی ہی دکھائی دیتی ہے۔

مستقبل سے میرا تعلق جتنا ہے اس سے بھی صرف دو زمانوں کا انسان
ہوں ماضی اور حال — یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں
اور میری کل زندگی بھی انہی کی پابند ہے۔ گو کہ انسان ماضی حال اور مستقبل
تینوں زمانوں کے تھپیڑوں پر جیتے ہیں۔ بہرکیف تربیت کے لئے اگر میری بہتر
اجنبیت لئے ہوئے ہوں تو اس میں تعجب ہی کیا ہے ہیں گو چاہوں کہ
نظمیں لکھنے کی بجائے سائنس دان کی زندگی بسر کروں۔ مگر یاد رہے میں
تیزی پیدا کروں تحقیق پیدا کروں تو مجھے وقت کے دو گھیروں سے نکل

پڑے گا۔ مگر اکثریت چاہے کہ اپنے بیوی بچوں اور گھر بار کی دلکشی سے
ہٹ کر میری نظموں کو آسانی اور آسائش سے سمجھ سکے تو اسے تین گھنٹوں
کی حدبندی دور کرنا ہوگی۔ اکثریت کی نظمیں الگ ہیں میری نظمیں الگ ہیں۔
اور چونکہ زندگی کا اصول ہے کہ دنیا کی ہر بات ہر شخص کے لئے نہیں ہوتی اس لئے
یوں سمجھئے کہ میری نظمیں بھی صرف انہی لوگوں کے لئے ہیں جو انہیں سمجھنے کے
اہل ہوں یا سمجھنا چاہتے ہوں۔ اور اس کے لئے کوشش کرتے ہوں۔ کوشش
ہی سے وقت کی پابندیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ کوشش ہی سے معلوم
کیا جا سکتا ہے کہ سورج پورب سے نکل کر پچھم میں صرف اس لئے چھپ
جاتا ہے کہ ہم اس زمین پر کھڑے ہیں۔ اگر مکان کی قید نہ ہو تو زمان کی قید
بھی نہیں رہتی۔ ایک لامحدود فضا سامنے نظر آتی ہے جس میں ایک گمبھیر اٹل
اور مسلسل موزونیت کارفرما ہے۔

ہم دن بھر اس زمین پر مختلف خواہشات کو پورا کرنے کے لئے مختلف
کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ رات آتی ہے اور پوری کائنات
ہمیں جاگ کر دکھائی دیتی ہے۔ اکثر چاند بھی روشن نظر آتا ہے۔ چاندنی کیا
پڑا ہے۔ چاند نہ بھی ہو تو اربوں میلوں کے فاصلے سے ستارے ...
چمک رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے کب سے چمک رہے ہیں۔ نہ جانے ...
یونہی چمکتے رہیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمان و مکاں کے یہ فاصلے کبھی ...

نہ مرتے نہ جیتے ۔ نہ جیتے نہ مرتے بس یوں ہی ہوتے ۔ مگر ہوتے کیا ؟ ایک خیال ۔ کاش ہم انسان نہ ہوتے ہم دیوتا بننے کی بے کار کوشش نہ کرتے ۔ ہم محض ایک بے جان چیز ہوتے ۔ ہم محض ایک تصور ہوتے ۔ ایک خیال —— وقت ۔ ہاں وقت ہوتے ۔ ہر شئے پر محیط ۔ اٹل وقت ۔ پھر ہر بات ہماری تابع ہوتی ۔ ہر عمل ہماری گرفت میں ہوتا ۔ مگر —— اس صورت میں نہ آپ ہوتے نہ میں ہوتا نہ یہ نظمیں اور نہ ان کا یہ دیباچہ ۔ نتیجہ :-

جو بھی شئے جس طرح ہے اچھی ہے ۔ بہت اچھی ہے ۔ اگر ہم اس تک پہنچ سکتے ہیں تو اس کی خوبیوں سے ہمیں لطف اندوز ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے اس کے عیبوں کو دور کرنا چاہیئے ۔ اگر ہم اس شے تک اس انسان تک اس مرد عورت —— اس نظریہ تک نہیں پہنچ پاتے تو ہمیں اپنی منفی حیات کو مثبت بنانے اور یوں تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔

مگر کہیں آپ دل میں یہ نہ سمجھیں کہ نظمیں تو الگ رہیں دیباچہ بھی اسی دھندلکے میں گم ہوا جا رہا ہے اس لئے چند ضروری باتیں کر لی جائیں ۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کا محض جنسی پہلو ہی میری توجہ کا واحد مرکز ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے ۔ جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں ۔ اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گذرتی ہے ۔ اس لئے ردعمل کے طور پر میں دنیا کی مسرت کو جنس

کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور ـــــ جو میرا آدرش ہے

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں صرف کھری بات کہنے کا عادی ہوں لیکن ذرا سا تکلف کر کے یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ بہت سی اور باتوں کی طرح مذہب ایک اضافی تصور ہے۔ اور پھر زندگی بھی تو ایک سدا کا ہو ایک جال کھیلیں، ایک پہیلی۔ اسے بوجھ نہ سکے تو ہم زندہ نہیں مردہ ہیں۔ مختلف انسانوں میں اہلیت کے مختلف درجے ہیں اور عبارت کے مختلف طریقے انہیں حاصل ہیں۔ اُن سے کام لینا ہی زندگی کا نام ہے۔

بہت سے لوگ مجھے صرف اردو کی آزاد نظم کا پرستار سمجھتے ہیں کہ آزاد نظم کو میں موضوع یا فنی ضروریات ہی کے لحاظ سے جائز سمجھتا ہوں۔ اس مجموعے کی پابند اور آزاد نظموں کا تنوع اس کی دلیل ہے میں نے اس مجموعے میں اُن نظموں کی اکثریت رکھی ہے جو اب تک کسی نہ کسی رسالے میں شائع ہو چکی ہیں۔ صرف ایک تہائی سے کچھ کم حصہ غیر مطبوعہ نظموں کا ہے۔ ان سب کی ترتیب شدید پابندی کے ساتھ اپنی تخلیق کی تاریخ کے لحاظ سے ہے۔

مجموعے کے انتخاب میں مختار صدیقی اور قیوم نظر اور ان کی تیاری میں

منشی محمد شریف کا شکریہ ضروری نہیں کیونکہ یہ تینوں صاحب میرے دل کے قریب ہیں۔

آخر میں انتساب کی وضاحت۔ ہر شہر کی ایک شخصیت یا انفرادیت ہوتی ہے۔ دلی کا بھی یہی حال ہے۔ دلی ایک بزرگ خاتون کی طرح ہے جو ہندوستان کی کل تاریخ کی نمائندہ ہے۔ اس شہر میں مختلف زمانے یکجا ہوتے ہیں۔ اور اس کی زندگی اپنی ہی راکھ سے ہمیشہ اپنا نیا لباس تیار کرتی ہے۔ یوں کہ سنت کی بدلتی ہوئی زندگی کا عکس اس بزرگ خاتون میں مجھے دکھائی دیتا ہے۔ اور اپنی ذات بھی اب تک مجھے ایک ایسا ہی عکس محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے میں اس بزرگ خاتون سے اپنے کو ہم آہنگ پاتا ہوں۔ اس کے پہلو میں آج سے تقریباً ایک سال پہلے میری مٹتی ہوئی زندگی نئے لباس میں ظاہر ہوئی۔ چنانچہ میرے کلام کا یہ مجموعہ اسی شہر، اسی بزرگ خاتون کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے۔

میراجی

میراجی کی نظمیں

چل چلاؤ

بس دیکھا اور پھر بھول گئے ،
جب حُسن نگاہوں میں آیا
من ساگر میں طوفان اُٹھا
طوفان کو چنچل دیکھ ڈری، آکاش کی گنگا دودھ بھری
اور چاند چھپا تارے سوئے طوفان مٹا، ہر بات گئی
دل بھول گیا پہلی پوجا، من مندر کی مورت ٹوٹی
دن لایا باتیں انجانی، پھر دن بھی نیا اور رات نئی،
پریتم بھی نئی پریمی بھی نیا، سکھ سیج نئی ہر بات نئی
اک پل کو آئی نگاہوں میں جھلمل جھلمل کرتی، پہلی،
سندرتا اور پھر بھول گئے ،
مت جانو ہمیں تم ہرجائی ،
ہرجائی کیوں ایسے! کیسے ؟
کیا یاد جو اک لمحے کی ہو وہ یاد نہیں کہلائے گی ؟

جو بت ہو دل کی، آنکھوں کی،
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو؟
جیسی بھی جہاں جو بات ہو گزری اس سے دل کو گزرنے دو۔
جب تک ہے زمیں
جب تک ہے زماں
یہ حسن و نمائش جاری ہے!
اس ایک جھلک کو بھیگتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو

ہم اس دنیا کے مسافر ہیں
اور قافلہ ہے ہر آن رواں،
ہر بستی، ہر جنگل، صحرا اور روپ منوہر ہر بت کا
اک لمحہ من کو لبھائے گا، اک لمحہ نظر میں آئے گا۔

ہر منظر، ہر انسان کی دنیا، اور میٹھا جادو عورت کا
اک پل کو ہمارے بس میں ہے، پل بیتا، سب مٹ جائے گا۔
اس ایک جھلک کو بھیگتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو،
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو؟

کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی؟

ہے چاند فلک پر اک لمحہ،
اور اک لمحہ یہ ستارے ہیں،
اور عُمر کا عرصہ بھی، سوچو! اک لمحہ ہے!

سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء

دیوداسی اور پجاری

لو ناچ یہ دیکھو، ناچ، پونر ناچ اک دیوداسی کا،
دھیرے دھیرے دُور ہوا سب سایہ میرے دل سے دل کی داسی کا
تول تول کر پاؤں سے رکھتی، ہلکے ہلکے، ایسے، میرا من چاہے
بن کر چندرا کا اُجیالا اس دھرتی پہ بکھر جائے!
میں پتھریلے کھمبے کے پیچھے چھپ کر اس کو دیکھوں،
چپکے چپکے حیرانی میں یوں سمجھوں
جیسے دیوی کی مورت ہی جی کر ناچ رہی ہو ناچ!
یا کیسوے سے جل پریوں کے جھرمٹ کی رانی دھرتی پر آئی ہو،
اور پانی کی لہروں ایسے ہلتی جائے، لہرائے،
یا جنگل کی چنچل ہرنی پتوں پر پھسلی جائے،
ایک اندھیرے بن کی ناگن پھنکارے اور بل کھائے،
جیسے میری للچائی نظریں پچکاریں اس کا انگ
دیوداسی دھرتی سے چھو کر دیوے دکھلائے رنگ:
کالی کالی چمکتی آنکھیں بجلی جیسا ناچ کریں

اور ہیرے موتی کے گہنے اُجیالے میں یوں چمکیں
جیسے اونچے نیلے منڈل میں چاند اور تارے ناچیں!

بانہوں میں چھن چھن کر آتی ہوئی انگیا کی سلوٹ کو
جب میں دیکھوں دل میں زور کی دھڑکن ہو،
اور تیزی سے سانس چلے!
لمبے، ڈھیلے ڈھالے دامن میں لہروں کے بہنے سے
اور گھوم کے پڑنے سے
ذہن کی، اک رگ تھرکے،
آہوں کا نغمہ نکلے!
آگے آنا، پیچھے جانا، ٹھٹک ٹھٹک کر رہ جانا
سنبھل سنبھل کر گرتی جائے، گر گر کر سنبھلے لے،
ڈرنا جھجکنا، پھر شوخی سے، بے بسی سے بڑھ آنا،
ڈگمگ ڈولے دھرم کی ناؤ، ڈگمگ میرا دھرم کرے!

ناچ ناچ کر جب تھک جائے، تھک کر ہو جائے بلکان،

لے جائے گیسو لی میری، چین مرا اور میرا گیان :

اور پھر ایسا موہن منظر آنکھوں سے اوجھل ہو جائے،
جب پتھر سے، اونچے کھمبوں کے سائے اُس سے لپٹیں،
جیسے گھٹائیں چمکتی بجلی کو اپنے دامن میں لیں۔

نارسائی

رات اندھیری، بن ہے سُونا، کوئی نہیں ساتھ،
پَون جھکولے پیڑ ہلائیں، تھر تھر کانپیں پات،
دل میں ڈر کا تیر چُبھا ہے، سینے پر ہے ہاتھ،
رہ رہ کر سوچوں یوں کیسے پوری ہوگی رات؛

برکھا رُت ہے اور جوانی، لہروں کا طوفان،
پیتم ہے نادان، مرا دل رسموں سے انجان،
کوئی نہیں جو بات سُجھائے، کیسے ہوں سامان؛
بھگوان! مجھ کو راہ دکھا دے، مجھ کو دے نے گیان؛

چپّو ٹوٹے، ناؤ پرانی، دُور ہے کھیون ہار،
بیری ہیں ندی کی موجیں اور پیتم اُس پار،
سُن لے سُن لے دُکھ میں پکارے اک پریمی بیچارا،
کیسے جاؤں، کیسے پہنچوں، کیسے جتاؤں پیار؛

کیسے اپنے دل سے مٹاؤں برہ اگن کا روگ!
کیسے سمجھاؤں پریم پہیلی، کیسے کروں سنجوگ؟
بات کی گھڑیاں بیت نہ جائیں دور ہے اس کا دیس
دور دیس ہے پیتم کا اور بیچ پڑے ہیں جنگل بیس ٭

کٹھور

دھرتی پر پربت کے دھبے، دھرتی پہ دریا کے جال،
گہری جھیلیں، چھوٹے ٹیلے، ندی نالے، باولی، تال،
کالے ڈراونے والے جنگل، صاف چمکتے سے میدان
لیکن من کا بالک اُلٹا ہٹ کرتا جائے ہر آن،
انوکھا لاڈلا، کھیلن کو مانگے چندرمان؛

سندر سانولی موہن گوری گود میں لیں کاندھے سے لگائیں
میٹھی دردیلی نئی صدائیں، لوری گیت سنائیں،
لیکن روئے، روئے مچلے، مچل مچل کر رو بیٹھان،
میرے من کا بالک اُلٹا ہٹ کرتا جائے ہر آن،
انوکھا لاڈلا، کھیلن کو مانگے چندرمان،

چُن چُن کھلونے، صاف اور اُجلی، نرم نرم سی سیج بچھائیں
سکھ شانتی جو ہیں چہیتے، سو نازوں سے ساتھ سلائیں
سوئے نہ سوئے تو اور دل کو جگائے جگ نے ٹھکرا ان
میت کے من کا بالک اُلٹا ہٹ کرتا جائے ہر آن؛
انوکھا لاڈلا، کھیلن کو مانگے چندرمان!

سنہ ۱۹۳۵ء

ایک عورت

سُر میٹھے ہیں، بول رسیلے، گیت سنانے والی تُو،
میرے ذہن کی ہر سلوٹ میں پھیلی نغمے کی خوشبو،
راگنی ہلکے ہلکے ناچے جیسے آنکھوں میں آنسو!
میرے دل کا ہر اک تار
بن کر نغمے کی اک دھار
ظاہر کرتا ہے تیرے پازیبوں کی مدھم، موہن،
مستی لانے والی جھنکار!
تیرے ذہن کی لہروں میں پایا ہے مسلا مسلا گیت،
یا ہے بھولے دل کی پہلی ننھی، نازک، ناداں پریت،
سادہ سادہ لیکن پل میں سب کے دل پر پائے جیت!
میرے دل کا ہر اک تار
ہوتا جاتا ہے سرشار
ایسے جیسے گرتے میٹھے سپنوں کی مدھم، موہن،
مستی لانے والی جھنکار!

برہا

سیمابی اور عنابی چیتے ہیں اندھیری راتوں کے،
جیسے منتر ہوں جنگل کے جادوگر کی باتوں کے،
یا ساون میں کالی گھٹاؤں کی بھیگی برساتوں کے
دل پر چھانے والے نغمے، بے ہوشی لانے والے!

ایسی راتیں ― چند اگھونگٹ کاڑھے چپکے سوئے ہیں،
اور گنتی کے چند ستارے نیندمیں کھوئے کھوئے ہیں
پیڑ اور پتّے، ٹہنی ٹہنی تاریکی میں دھوئے ہیں،
دل کو ڈرانے والے سائے، دل کو دہلانے والے!

سائے، کالے کالے سائے رینگ رینگ کر چلتے ہیں،
اور ان کالے سایوں سے بھوتوں کے جھنڈ ابلتے ہیں،
دل میں اندھے، بے بس، بے پایاں جذبات مچلتے ہیں
گیت بنانے والے، نغمے چاہت کے گانے والے!

دُکھ دل کا دارو

سفید بازو،
گداز اتنے
زبان تصور میں حظ اُٹھائے
اور انگلیاں بڑھ کے چھونا چاہیں مگر انہیں برق ایسی لہریں
سمٹتی مٹھی کی شکل دے دیں،
سفید بازو گداز اتنے کہ اُن کو چھونے سے اک جھجک رُو کتی چلی جائے، ردک ہی دے،
اور ایسے احساس اپنی خاصیتیں بدل کر
تمام ذہنی رگوں کے تاروں کو چھیڑ جائیں
اور ایک سے ایک مل کے سب تار جھنجھنائیں
اور ایک جھنجھد کے گرد ہیں لیتی گونج کو نیند سے جگائیں
اور ایسے بیدار ہوں اچھوتے، عجیب جذبے:
میں ان کو سہلاؤں اتنی شدت سے، چٹکیاں لوں کہ سہکیں سطح عکس بن جائے نیلگوں بحرِ بیکراں کا.
اور اس طرح دل کی گہری خلوت میں ایسی آشائیں کروٹیں لیں

کہ ایک خنجر

اُتار دوں میں چھپا چھپا کر

سفید، مرمر سے مخملیں جسم کی رگوں میں۔

اور ایک بے بس، حسین پیکر

مچل مچل کر تڑپ رہا ہو

مری نگاہوں کے دائرے میں،

رگوں سے خوں کی اُبلتی دھاریں

نکل نکل کر پھسل رہی ہوں پھسلتی جائیں

سفید، مرمر سے جسم کی چاند رنگ ڈھلوان سے ہر اک بوند گرتی جائے

لپٹتی جائے ادھورے، بکھرے ہوئے پریشاں لباس کی خشک و تر تہوں میں،

اور ایک بے بس حسین عورت کے آنسوؤں میں

مری تمنائیں اپنی شدت سے تھک تھکا کر

عجیب تسکین اور ہلکی سی نیند کے اک سیاہ پردے میں چھپتی جائیں

سیاہ پردہ وہ رات کا ہو! ——

۳۷

سرگوشیاں

آج رات
میرا دل
چاہتا ہے تُو بھی میرے پاس ہو،
اور سوئیں ساتھ ساتھ۔

تیرے پیراہن مجھے
یاد آتے ہیں بہت،
آسماں بھی صاف ہے
اور ستارے اور چاند
بے خود و سرمست ہیں،
تازگی
ہے عیاں
ذرّے ذرّے سے زمیں کے۔ آہ لیکن بے بسی،
اور تنہائی مری!

آج تو آجا، مری ہمراز بن،
آبھی جا،
یے، گھٹائیں آرہی ہیں بے نشاں رفتار سے
اور ان کالی گھٹاؤں میں ہے سرمستی، خمار،
اور پانی کے ہیں تار،
تو بھی آ،
مل کے ہم
آج رات
گا ہی لیں چاہت کا گیت؛
جسم بھی تیرا مجھے مرغوب ہے۔
اور تیری ہر ادا
اور یہ چہرہ ترا
محبوب ہے

تیری یہ پیاری جوانی اک اچھوتی سی کلی
اور صورت سادی سادی سانولی،
اور تیرے بالوں میں یہ چمپا کے پھول،

اور نازک ہاتھ پر لپٹا ہُوا گجرا ترا ،
اور گلے میں ایک ہار ،
آہ تیرے سب سنگار
کھینچتے ہیں دل کے تار
اور اک ہلکی سی گُونج
اِس فضا کی وسعتوں میں کھو گئی :

آ مری ننھی پری !
آ مری من موہنی !
آج رات
چاہتا ہوں تو بھی میرے پاس ہو۔

کیفِ حیات

نرم اور نازک، تند اور تیز،
میٹھا میٹھا درد مرے دل میں جاگا؛
میرا ہے، میرا ہے جھولا خوشیوں کا!
مست، ہو ہر، میٹھا میٹھا درد مرے دل میں جاگا!
جھول رہی ہوں، جھول رہی ہوں سندر جھولا خوشیوں کا!

نرم بہاؤ تند اور تیز،
پیارے لمحے جنوں انگیز،
میٹھا میٹھا درد مرے دل میں جاگا!

جیون کی ندی رک جائے،
رک جائے تو رک جائے،
رک جائے تو رک جائے،
صرف مرے احساس کی ناؤ چلتی جائے، نرم اور تیز!

گرم لہو رگ رگ میں مچلتا،
ساتھ ہے سپنوں کے میتم کا،
خوشیوں کا جھولا ہے میرا،
جھول رہی ہوں، جھول رہی ہوں، نرم بہاؤ، نرم اور تیز!

جیون کی ندی رُک جائے، رُک جائے جیون کا راگ،
رُک جائے تو رُک جائے،
رُک جائے تو رُک جائے
رُک جائے تو رُک جائے
میٹھا میٹھا درد مرے دل میں جاگا،
جھول رہی ہوں، جھول....

دُور و نزدیک

ترا دل دھڑکتا رہے گا
مرا دل دھڑکتا رہے گا
مگر دُور دُور!
زمیں پر سہانے سمے آ کے جاتے رہیں گے
یونہی دُور دُور!
ستارے چمکتے رہیں گے
یونہی دُور دُور!
ہر اک شے رہے گی
یونہی دُور دُور!
مگر تیری چاہت کا جذبہ،
یہ وحشی سا نغمہ،
رہے گا ہمیشہ
مرے دل کے اندر
مرے پاس پاس۔

سنجوگ

دن ختم ہُوا، دِن بیت چُکا،
رفتہ رفتہ ہر نجم فلک اِس اونچے، نیلے منڈل سے
چوری چوری یُوں جھانکتا ہے
جیسے جنگل میں کٹیا کے اِک سیدھے سادے دوارے سے
کوئی تنہا چُپ چاپ کھڑا چھُپ کر گھر سے باہر دیکھے!
جنگل کی ہر اک ٹہنی نے سبزی چھوڑی، شرما کے چھُپی تاریکی میں،
اور رنگ برنگے پھولوں کے شعلے کالے کاجل بن کر روپوش ہوئے،
اور بادل کے گھونگٹ کی اوٹ سے ہی تکتے تکتے چنچل چندا کا رُوپ بڑھا!
چندا کرشن ـــ ستارے ہیں جھرمٹ برندا کی سکھیوں کا!
اور زُہرہ نیلے منڈل کی رادھا بن کر کیوں آئی ہے!
کیا رادھا کی سندرتا چاند بہاری کے من بھائے گی!
جنگل کی گھنی گپھاؤں میں جگنو جگمگ جگمگ کرتے، جلتے بجھتے اچکارے ہیں!
اور جھینگر تال کنارے سے گیتوں کے تیر چلاتے ہیں،
نغموں میں بہتے جاتے ہیں!

لو آدھی رات دُلھن کی طرح شرماتی تھی، اب آ ہی گئی۔
ہر ہستی پر اب نیند کی گہری مستی چھائی ـــــ خاموشی!
کوئل بولی!
اور رات کی اس تاریکی میں، ہی دل کو دل سے ملائے ہیں
پریمی پریتم ـــــ
ہاں، ہم دونوں!

چنچل

"کبھی آپ ہنسے، کبھی نین ہنسیں، کبھی نین کے بیچ ہنسے کجرا"
کبھی سارا سُندر انگ ہنسے، کبھی انگ لگے ہنس دے گجرا،
یہ سُندرتا ہے یا کوِتا، میٹھی میٹھی مستی لائے،
اس روپ کے ہنستے ساگر میں ڈگ مگ ڈوبے من کا بجرا،
یہ موہن مدھ متوالی ہے، یہ مے خانے کی چنچل ہے
یہ روپ لٹاتی ہے سب میں، پر آدھے مُنہ پر آنچل ہے:
کیا ناز انوکھے اور نئے سیکھے اِندر کی پریوں سے
اور ڈھنگ منوہر اور زہری سونگھے ساگر کی پریوں سے!
پہلے سپنے میں آتی ہے، پازیبوں کی جھنکاروں میں
آوارہ کرکے چین مرا، چھپ جاتی ہے سیّاروں میں۔

ناگ سبھا کا ناچ

ناگ راج سے، ناگ راج سے ملنے جاؤں آج،
ناگ راج ساگر میں بیٹھے سر پر پہنے تاج،
ناگ راج کی سبھا جمی ہے خوشبوئیں لہرائیں،
بہتی، رُکتی، اُلجھتی جاتی، من کو مست بنائیں،
چندرماں کی کرنیں آئیں بل کھائیں — بل کھائیں،
ننھے ننھے، ہلکے ہلکے، میٹھے گیت سنائیں،
گاتے گاتے تھکتی جائیں، سوئیں سُکھ کی نیند،
(ناگ سبھا میں) ہلکی ہلکی، میٹھی میٹھی نیند،
کچھ گھڑیاں یوں بیتیں اور پھر سنکھ بجائیں ناگ،
وحشی اور بے باک، انوکھے نشے لائیں ناگ،
سوئی کرنیں جاگ اُٹھیں اور ناچیں سندر ناچ،
دیوداسی یاد آجائے، ہاں — اور مندر — ناچ،
ناگ سبھا کے ناچ انوکھے، سارا ساگر — ناچ،
میرا من بھی بنتا جائے دیکھ دیکھ کر — ناچ۔

آمدِ صُبح

دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!
نہ ٹھہرے گا یہ سر پر رات کی رانی کے اک پل کو!

یہ روشن اور اُجلا چاند یعنی رات کا پریمی
یہ اس کو جگمگاتے ، بہیلے تاروں سے
سجا کر لایا ہے گھر سے۔
مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد!
دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا۔

ہے دل میں چاند کے جذبہ محبت کا،
چھپاتا ہے وہ غیروں کی نگاہوں سے اُڑھا کر اک دوپٹہ اس کو تاروں کا
مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد،
فضا کے گلستاں میں پھرتی ہے اٹکھیلیاں کرتی ،
ہوائیں گیسوؤں کو اُس کے چھُو کر دوڑ جاتی ہیں ،

دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!

وہ تو، پیلا پڑا روشن سا چہرہ چاند کا بالکل!
اُسے افسوس! اندیشوں نے گھیرا ہے!
اُسے خطرہ ہے نخیروں کا،
ہے جذبہ اُس کے دل میں تند چاہت کا!
مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد،
وہ اِن کیفیتوں کو دل میں لاتی ہی نہیں بالکل!

دوپٹہ شب کا ڈھلکا، ہاں وہ ڈھلکا جس طرح نغمہ
کسی رانی کے دل سے اُٹھ کے اک دم بیٹھ جاتا ہے۔

پرندے چہچہاتے ہیں،
وہ لو، سورج بھی اپنی سیج پر اب جاگ اُٹھا ہے،
گئی رات اور دن آیا۔

سنہ ۱۹۳۶ء

ایک تصویر

سولہ سنگاروں سے سج کر اک سیج پہ گوری بیٹھی ہے،
پیتم آئے نہیں، آئیں گے، چپکی رستہ تکتی ہے۔

لاکھ لگا کر، پاؤں سجائے جگمگ جگمگ کرتے ہیں،
پریمی دل کو گرم، اُبلے، وحشی خون سے بھرتے ہیں،
نینوں میں کاجل کے ڈورے اَنگ اَنگ برماتے ہیں
ننھے، کالے کالے بادل جگ پر چھائے جاتے ہیں،
ماتھے پر سیندور کی بندی یا آکاس پہ تارا ہے
دیکھ سکے آ جائے گا جو بھولا بھٹکا آوارہ ہے؛
نرم، رسیلے، صاف، پھسلتے گال پہ تِل کا بھنورا ہے
رُوم رُوم سندر کا سنگاروں سے سنورا سنورا ہے۔
کانوں میں دو بُندے جیسے ننھے مُنّے جھولے ہیں
چنچل اچپل سندرتا کے سُکھ میں سب کچھ بھولے ہیں
چوڑا بیل بنا لپٹا ہے، باہیں گویا ڈالی ہیں۔
بیل اور ڈالی کی روحیں یوں مست ہیں، متوالی ہیں،

لیکن جب تم آئے نہیں ہیں، آئیں گے، آ جائیں گے،
اِندر نگر کی خوشیوں والی بستی آ کے دکھائیں گے،
پھر پاؤں کی پازیبیں پریوں کو راگ سنائیں گی۔
میٹھے لحنوں کی باتوں کے گیتوں سے بہلائیں گی۔

اغوا

چاند خاموش ہے، فضا خاموش
راہ خاموش ہے، ہوا خاموش،

سارے عالم پہ چھائی خاموشی
نیند کی پُرسکون بے ہوشی

دھیرے دھیرے قدم اُٹھائیں ہم
اور بستی کو چھوڑ جائیں ہم،

دیکھو، محدود زندگی کیوں ہو؟
غیر کے بس میں سرخوشی کیوں ہو؟

آؤ، بھولو سماج کی باتیں،
اپنی ہیں اب سے چاندنی راتیں؛

آؤ پابندیوں کو بھولو تم،
آؤ آزادیوں کو چھو لو تم،

دل کی افسردگی کو دُور کرو،
دل سے پژمردگی کو دور کرو،

آج کی رات ہے مسرت کی
آج ہر بات ہے مسرت کی،

آج تکمیل جذبۂ دل کی
ہوگی ہمدم ہماری محفل کی۔

کشتیٔ عمر چھوڑ دو — آزاد،
اپنی ہستی کو اب کرو — آزاد:

ہاتھ میں ہاتھ تھام لو میرا،
اب سے بس ایک نام لو — میرا!

ہو کے تحلیل میری ضو میں تم۔
آؤ چل دو مرے جلو میں تم،

چار دن کے لئے مری بن جاؤ،
مرے ہمراہ آؤ، چل دو — آؤ!

زندگی چار دن ہے، چار ہی دن؛
دل میں چاہت ہے چار دن ساگن،

رات ایسی نہ آئے گی پھر سے،   وقت ایسا نہ لائے گی پھر سے
چاند خاموش ہے، فضا خاموش،   سارا عالم ہے نیند میں بے ہوش

چپکے چپکے قدم اٹھائیں ہم،
آؤ آؤ، یہاں سے جائیں ہم

ابوالہول

بچھا ہے صحرا اور اس میں ایک ایستادہ صورت بتا رہی ہے
پرانی عظمت کی یادگار آج بھی ہے باقی؛

نہ اب وہ محفل، نہ اب وہ ساقی
مگر انہی محفلوں کا اک پاسباں کھڑا ہے؛
فضائے ماضی میں کھو چکی داستانِ فردا
مگر یہ افسانہ خواں کھڑا ہے؛
زمانہ ایوان ہے، یہ اس میں سُنا رہا ہے پرانے نغمے،
ہیں ایک ناچیز و ہیچ ہستی
فضائے صحرا کے گرم و ساکن، خموش لمحے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے
ابھی وہ آجائیں گے سپاہی
وہ تُند فوجیں
دلوں میں احکام بادشاہوں کے لے کے آجائیں گی اُفق سے؛

ہوائے صحرا نے چند ذرّے کئے پریشاں
ہے یا وہ فوجوں کی آمد آمد!
خیال ہے، یہ فقط مرا اک خیال ہے، ہیں خیال سے دل میں ڈر گیا ہوں،
مگر یہ ماضی کا پاسباں پُرسکون دل سے
زمیں پہ اک بے نیاز انداز میں ہے قائم۔

میں ڈرتا ہوں مسرّت سے

میں ڈرتا ہوں مسرّت سے،
کہیں یہ میری ہستی کو
پریشاں، کائناتی نغمۂ مبہم میں اُلجھا دے؛
کہیں یہ میری ہستی کو بنا دے خواب کی صورت!

مری ہستی ہے اک ذرّہ
کہیں یہ میری ہستی کو چکھا دے مہرِ عالمتاب کا نشّہ؛
ستاروں کا علمبردار کر دے گی مسرت میری ہستی کو
اگر پھر سے اُسی پہلی بلندی سے ملا دے گی
تو میں ڈرتا ہوں ــــ ڈرتا ہوں
کہیں یہ میری ہستی کو بنا دے خواب کی صورت؛

میں ڈرتا ہوں مسرّت سے
کہیں یہ میری ہستی کو

بھلا کر تلخیاں ساری
بنا دے دیوتاؤں سا
تو پھر میں خواب ہی بن کر گذاروں گا
زمانہ اپنی ہستی کا۔

بلندیاں

دیکھ انسانوں کی طاقت کا ظہور،
اک سکونِ آہنیں ہمدم ہے میرا، اور میں
روزنِ دیوار سے
دیکھتا ہوں کوچہ و بازار میں،
آرہے ہیں، جا رہے ہیں لوگ ہر سُو — گرمِ رو:
اور آہن کی سواری کے نمائندے بھی ہیں،
تیز آنکھوں، نرم قدموں کو لیے،
محو گہرے نشۂ رفتار میں؛
اور یہ اونچا مکان
جس پہ استادہ ہوں میں
جذبۂ تعمیر کا اظہار ہے، —
سرخرو، دل میں اولوالعزمی لئے؛
رات کی تاریکیاں ہر شے پہ ہیں چھائی ہوئی،
لیکن ان تاریکیوں میں ہیں درخشاں چشم ہائے دیوِ تہذیبِ جدید:

اک سکونِ آہنیں ہمدم ہے میرا، اور میں
سوچتا ہوں عرصۂ انجم کے باشندے تمام
دل میں کہتے ہوں گے ——— ہیچ!

سنہ ۱۹۳۷ء

اجنبی انجان عورت کی

میں دُھندلی نیند میں لپٹا تھا سو دوں سے وہ جاگ اٹھی

ہلکے ہلکے بہتی آئی اور چھائی میٹھی خوشبو سی:

باریک دوپٹہ سر پہ لیے اور آنچل کو قابو میں کیے

چنچل نینوں کو اوٹ دیے شرمیلا گھونگھٹ ڈھائے تھی۔

خوش وش بدن اک چندر کرن، اٹھلاتا جوبن بت من موہن۔

میں کون ہوں، کیا ہوں، کیا جانے من لب میں کیا؟ وہ بھول گئی!

جب آنکھ کھلی اور ہوش آیا تب سوچ لگی، الجھن سی ہوئی۔

پھر گونج سی کانوں میں آئی وہ سندر تھی سپنوں کی پری!

محبت

زرد چہرہ شمع کا ہے اور دھندلی روشنی
راہ میں پھیلی ہوئی،
اک ستون آہنیں کے ساتھ استادہ ہوں میں،
اور ہے میری نظر
ایک مرکز پر جمی؛
آہ! اک جھونکا صبا کا آ گیا
باغ سے پھولوں کی خوشبو اپنے دامن میں لیے!

ساری بستی نیند میں بے ہوش ہے
رہ رو کوئی نہیں،
راہ سب سونی ہوئی؛
آسماں پر حکمراں ہے شب کی گہری تیرگی،
اور فضا میں خامشی کے سانس کی آواز ہے،
اور ہے میری نظر

ایک مرکز پہ بھی،
سامنے
روزنِ دیوار سے
ایک سایہ مجھ کو آتا ہے نظر۔

سنہ ۱۹۳۹ء

سنگِ آستاں

سکھا نغمہ محبت کا، مجھے محسوس کرنے دے
جوانی کو
ہے نغمہ جن میں خوابیدہ انہیں تاروں کی حرکت سے
میں لے آؤں گا ہستی کو مجسّم شکل کی صورت،
اُنہیں تاروں کو خوابوں سے جگانے دے مجھے اے رات کے ساقی!
دکھانے دے مجھے جلوہ ستاروں کے اُلجھنے کا
اُسی منظر کو لے آؤں گا میں پھر سے نگاہوں میں
جو ہے باقی،
جو آویزاں ہے اب تک وقت کی دیوی کے آنچل میں
پکڑ کر ہاتھ میں تجھی کو اِس دھرتی کے جنگل میں
اِسی خلوت کے محمل میں
ترے دل میں
جگا دوں گا میں اپنی گرم آہوں سے
اُسی نغمے کو جو سویا ہے تیرے جسم کے محبوب تاروں میں:

مجھے معلوم ہیں باتیں،
وہ باتیں جو اچھوتی اور پرانی ہیں
مگر نادان ہیں جذبے،
ارادہ ہے کہ لے کر آج اِن جذبوں کو میں تاریک غاروں میں
بنوں گا ہم سفر تیرا!
چل، آ! رنگیں کہانی کو
شروعِ عشق کی منزل سے لے جائیں
اُسے اِس رات کے پھیلے اندھیرے میں
وہاں پر لے کے پہنچا دیں
جہاں ہے گوہرِ مقصود پوشیدہ نگاہوں سے
سہانی گرم آنسوؤں میں!

اُجالا

آشا آئی سارے من کے دُکھ اک پل میں مجھ کو بھُوے
مَن مندر میں سَت سنگت نے ایسی اُمنگیں آن جگائیں
جیسے کوئی ساون رُت میں پھُلواری میں جھولا جھولے
کومل لہریں میرے من میں ایک انوکھی شوبھا لائیں
جیسے اونچے، نیلے ساگر میں دو کونجیں اُڑتی جائیں
جیسے بسنتی سماں سہانا من کو چنچل ناچ نچائے !
حیرانی ہے میرے من میں ایسی باتیں کہاں سے آئیں :
من سویا تھا، سوئے ہوئے کو کون پکارے، کون جگائے ،
جیسے کوئی نوجیون کا ہرکارہ سندیسہ لائے !
جس کے من میں آشا آئے بس وہی سمجھے، وہی بتائے !

سنہ ۱۹۲۰ء

ترقی پسند ادب

اِس کو ہاتھ لگایا ہوگا ہاتھ لگانے والے نے،
بھُول ہے رادھا، بھنورا، بھنورا بھنورے نے ہاں کالے نے،
جمنا تٹ پر ناؤ چلائی ناؤ چلانے والے نے،
دھوکا کھایا، دھوکا کھایا، دھوکا کھانے والے نے،
سکھیاں کب تھیں لاج بچائیں، کچھ نہ سُنی متوالے نے،
کام نہ آیا، بات نہ رکھی اپنے دل کے اُجالے نے،

دِل کا اُجالا بنسی والا میٹھی جس کی بانی ہے،
بنسی دُھن کی بات نہ کہنا یہ تو پرانی کہانی ہے،
اب تو ساری دنیا بدلی ہر صورت انجانی ہے،
دل میں سب کے چھایا اندھیرا ظاہر ہی نورانی ہے،
یہ بھی رُت ہے مٹ جائے گی، ہر رُت آنی جانی ہے،
اِتنی بات کہ دل بے چین رہے جگ میں لافانی ہے،

دل بے چین ہوا رادھا کا کون اُسے بہلائے گا!
جمنا تٹ کی بات تھی ہونی، اب تو دیکھا جائے گا۔

چپکی سبھے گی رنگ وہ رادھا جو بھی سر پہ آئے گا،
اور خوش شیام پہیلی رہتی دنیا کو سمجھائے گا۔
پریم کتھا کا جادو سننے والوں کے دل پہ چھائے گا۔
یہ تو بتاؤ کون سورما اب کے ہاتھ لگائے گا؟

مندر میں

منتر بول میٹھے ۔

منتر بول میٹھے ، من بھاتے
دُکھ کو دُور کہیں لے جاتے
آئیں پجاری ، جائیں پجاری
سُکھ کی برکھا لائیں پجاری

منتر بول سے
پرم ایشور کے
کومل من کو رجھائیں پجاری
گائیں پجاری
منتر بول میٹھے ۔

آئے پروہت دُوب جلائے
آرتی کو ہاتھوں میں اُٹھائے
رُن جُھن رُن جُھن کیسی صدا ہے!

دل کا گنبد گونج رہا ہے،
سُکھ کی آشا
سُکھ کا سپنا
ناچ رہی ہے، جھوم رہا ہے،
یوں گاتا ہے
منتر بول میٹھے

جاگ اٹھی ہیں بیتی باتیں
یاد آتی ہیں پہلی راتیں
یاد آتی ہے دیوداسی
دل ہے پیاسا آنکھ بھی پیاسی
سُکھ ساگر میں
اس مندر میں
میرے دل میں چھائی اُداسی:
دیوداسی!
منتر بول میٹھے۔

سنہ ۱۹۳۱ء

دھوبی کا گھاٹ

جس شخص کے ملبوس کی قسمت میں لکھی ہے
کرنوں کی تمازت
رشک آتا ہے مجھ کو
اُس پر ۔

کیوں صرف اچھوتی ،
انجان ، انوکھا ،
اک خوابِ بے خلوت ؟
کیوں صرف تصوّر
بہلاتا ہے مجھ کو ؟

کیوں صبحِ شبِ عیش کا جھونکا
بن کر
رخسار کی بے نام اذیّت

بہلاتا ہے مجھ کو؟
کیوں خوابِ فسوں گر کی قبا چاک نہیں ہے؛
کیوں گیسوئے پیچیدہ و رقصاں
مشک نہیں ہے
اشکِ دلِ خوں ہے؛
کیوں لمس کی حسرت کے جنوں سے
تسکیں نہیں مجھ کو
سبب قیدِ رہائی؟

ملبوس پہ کرنوں کی تمازت
حشرِ دامِ نشتر کا،
اور صبح شبِ عیش کو گیسو کا مہکتا ہوا جھونکا
خونِ سحر کا
ہوتا ہی نہیں ہے۔

کیوں دھوتے نہ پیراہن آلودہ سے، دھبے
تخمیرِ مسرت؟

کرنوں کی تمازت
بن جائے نہ کیوں نشۂ شب عیش کا اک حصۂ احساس!

مجبورِ اذیت!
تو ان سے اس عکس کا منظر
دیتا ہے نشۂ جامِ جمشید کی سی لذت،
کیوں سوچ رہا ہے

مجبور ... پیاسا!
کیا تو نے نہیں دیکھی ہے تو نے
دوشیزۂ مسرت؟

پیتا ہے وحشت جو کسی پروانوں کی تمازت
شب زیست کے گیسو کی حرارت،
جس شخص کو یہ حسن آلودہ وسوسے ہی سے ... کی
ملتی ہے جہاں میں
تو اس پہ نظر کر۔

ہندی جوان

ساقِ سیمیں کا فسوں رنگِ جنوں لے آیا،
کیوں سکوں سرنگوں کر کے ہوا محوِ ملال؟
کیوں نظر آتے ہیں پھیلے ہوئے بازو مجھ کو؟
مری آنکھوں میں ہیں بازو اپنے
جیسے اک پیڑ کے ٹہنے ہوں کہیں پھیلے ہوئے
جن پہ طائر کا نشیمن کبھی بنتا ہی نہ ہو
سوکھتے جاتے ہوں ٹہنے غمِ محرومی سے

کیسی ڈھلوان سے پھسلا ہے شعور،
سوچ اک تیتری بن کر یوں اُڑی جاتی ہے:-
اے جوانسال! ترے دل کو لبھاتا ہے یہ منظر، لیکن
مرمریں قصر کا لذت سے یہ لبریز ستون
اپنی دوری، تری مجبوری سے
کہیں احساس کو ہی ساکت و جامد نہ کرے۔

اپنی محرومی پہ بل کھاتے ہوئے جھنجلا کر
جاگ اُٹھا ہے خیال
پیرہن شعلے کی مانند لپک اُٹھے ذرا
اور مجھے غرقِ مئے رنگ نسائی کر دے۔
لیکن اک منظرِ پس ماندہ نظر آئے گا۔
دلکشی جس کی جھپٹ کر مجھے آنے ہی نہ دے گی آگے
اس حکایت میں مَیں پس ماندہ ہی رہ جاؤں گا۔

ذہن آلودہ ہے افسانے سے
وہ جو دیکھا تھا ابھی پردۂ سیمیں پہ نگاہوں نے مری،
رقص میں پاؤں اُٹھے جاتے تھے سر سے اُوپر،
پیرہن کا تو کہیں نام نہ تھا۔
دل مرا غرقِ مئے رنگ نسائی ہو کر
جھوم اُٹھا تھا جب آیا انجام۔

اب وہ افسانہ حقیقت بن کر
لوٹ آیا ہے نگاہوں میں مری

لیکن اس منظرِ بے باک پہ اب
بارشِ پنبۂ لرزاں کی ردا چھائی ہے۔

چار ــــ ہاں چار ـــ فقط چار قدم
فاصلہ مجھ سے ترے جسم کا ہے۔
دسترس شعلہ بناتی نہیں پیراہن کو
پیرہن شمع کی مانند نہ لپکے گا کبھی۔
وہ جو دیکھا تھا ابھی پردۂ سیمیں پہ نگاہوں نے مری
وہ تو افسانہ تھا

میرے مقدور میں تھا اُس کا حصول،
جیب سے میری نکل کر چاندی
روشنی پر جا کے چپک اٹھی تھی
تجھ کو پانا یہ حقیقت نہیں قسمت میں مری
مرمریں قصر کا لذت سے یہ لبریز ستون
ترے دامن ہی میں پوشیدہ ہے۔

مجھ کو تسلیم ہے اے ہمدمِ افسانہ طراز!

چاک آنکھوں کے تو سِل سکتے ہیں،
نیند آسکتی ہے اب بارِ تقدیر سے مجھے،
جیب و دامن میں مگر دوری ہے۔
تو سمجھ سکتا نہیں ہے یہ بات؟
جیب تو میری ہے، دامن اُس کا۔

اُونچا مکان

بے شمار آنکھوں کو چہرے میں لگائے ہوئے استادہ ہے تعمیر کا اک نقشِ عجیب،
اے تمدن کے نقیب!
تری صورت ہے مہیب
ذہنِ انسانی کا طوفان کھڑا ہے گویا!
ڈھل کے لہروں میں کئی گیت سنائی مجھے دیتے ہیں، مگر
اُن میں اک جوش ہے بیداد کا، فریاد کا اک عکسِ دراز،
اور الفاظ ہیں افسانے ہیں بے خوابی کے۔
کیا کوئی رُوحِ حزیں
ترے سینے میں بھی بے تاب ہے تہذیب کے رخشندہ نگیں؟

گھُٹ کے لہریں ترے گیتوں کی مٹیں، مجھ کو نظر آنے لگا
ایک "تلخابہ" کسی بادۂ بدرنگ کا اک ٹوٹے ہوئے ساغر میں،
نشۂ مے سے نظر دھندلی ہوئی جاتی ہے
رات کی تیرہ فضا کیوں مجھے گھبراتی ہے؟

رات کی تیرہ فضا میں تری آنکھوں کی چمک مجھ کو ڈرا سکتی نہیں ہے، میں تو
اس سے بھی بڑھ کے اندھیرے میں رہا کرتا تھا؛
اور اُس تیرگی رُوح میں رخشاں تھے ستارے دُکھ کے،
اور کبھی بھول میں ہر نجم درخشاں سے لپک اُٹھتے تھے شعلے سُکھ کے
جیسے روزن سے ترے تان لپکتی ہوئی پھیلاتی ہے بازو اپنے،
جذب کر لیتا ہے پھر اُس کو خلا کا دامن،
یاد آنے لگے تنہائی میں بہتے ہوئے آنسو اپنے
وہی آنسو، وہی شعلے سُکھ کے،
لیکن اک خواب تھا، اک خواب کی مانند لپک شعلوں کی تھی،
مری تخیّل کے پر طائرِ زخمی کے پروں کی مانند
پھڑپھڑاتے ہوئے بے کار لرز اُٹھتے تھے،
مرے اعضا کا تناؤ مجھے جینے ہی نہ دیتا تھا، تڑپ کر، یکبار،
جستجو مجھ کو رہائی کی ہوا کرتی تھی،
مگر افسوس کہ جب درد دوا بننے لگا مجھ سے وہ پابندی ہٹی۔
اپنے اعصاب کو آسودہ بنانے کے لئے
بُھول کر تیرگیٔ رُوح کو میں آپہنچا
اِس بلندی کے قدم میں نے لئے

جس پہ تو سینکڑوں آنکھوں کو جھپکتے ہوئے استادہ ہے۔

ترے بارے میں سُنا رکھی تھیں لوگوں نے مجھے
کچھ حکایاتِ عجیب،
میں یہ سُنتا تھا ترے جسمِ گرانبار میں بستر ہے بچھا،
اور اک نازنیں لیٹی ہے وہاں تنہائی
ایک ہلکی سی تھکن بن کے گھُسی جاتی ہے
ذہن میں اُس کے، مگر وہ بے تاب
منتظر اس کی ہے پردہ لرزے
پیرہن ایک دھڑکتا ہوا بادل بن جائے۔
اور در آئے اِک ان دیکھی، انوکھی صورت۔
کچھ غرض اُس کو نہیں ہے اِس سے
دل کو بھاتی ہے، نہیں بھاتی ہے۔
آنے والے کی ادا ــــــ
اُس کا ہے ایک ہی مقصود، وہ استادہ کرے
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اک نقشِ عجیب
جس کی صورت سے کراہت آئے

اور وہ بن جائے ترا مدِّمقابل پل میں
ذہنِ انسانی کا طوفان کھڑا ہو جائے
اور وہ نازنیں بے ساختہ، بے لاگ ارادے کے بغیر
ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آنے لگے
شب کے بے رُوح تماشائی کو:
بھول کر اپنی تھکن کا نغمہ
مختصر لرزشِ چشم در سے
ریگ کے قصر کی مانند سبکسار کرے،
ترا عہدِ شباب، کی تعمیر کا اک نقشِ عجیب،
ایک گرتی ہوئی دیوار کی مانند لچک کھا جائے

یہ حسینہ [illegible]ے ذہن میں اک بوئے خراماں بن کر
جب کبھی چاہتی [illegible] رقص کیا کرتی تھی،
اور اب دیکھتا ہوں سینکڑوں آنکھوں میں تردد
ایک ہی چشمِ درخشاں سے مجھے آتی ہے نظر،
کیا اسی چشمِ درخشاں میں ہے شعلہ شکدہ کا؟
ہاتھ سے اپنے اب اس آنکھ کو میں بند کیا چاہتا ہوں۔

ایک منظر

پھیل رہی ہے سیاہی، رستہ بھول نہ جائے راہی،

آج اشنان کیا گوری نے (آج بھلا کیوں نہائی؟)
یہ سنگار جال مایا کا، اس نے کس سے نبھائی؟
مورکھ! چھوڑ نادانی کی باتیں، کیسی دُھن یہ سمائی؟

پھیل رہی ہے سیاہی، رستہ بھول نہ جائے راہی؛

جُھومی گیسو کی چھایا تو دھیان انوکھا آیا،
نٹ کھٹ بندرابن سے ساتھ میں رادھا کو بھی لایا،
رادھا مُکھ کی اُجلی مُورت، شیام گیسو کا سایا۔
سامنے جیوتی جاگ رہی ہے، پیچھے گھور اندھیرا،
دیکھ کے دو دنیاؤں کا جلوہ ڈول اُٹھا من میرا،
دونوں اڑائیں دھیان کے پنچھی کی جوگی والا پھیرا،

پھیل رہی ہے سیاہی، رستہ بھول نہ جائے راہی!

دونوں لوک دیکھ کے دھیان اِک اور ہی جگ کا آیا،
دُور سے دیکھو تو اندھیارا، پاس اُجیالے کی مایا،
مایا کا جب بندھن ٹوٹے، چھائے تھکن کا سایا،

پھیلے پھر سے سیاہی، رستہ بھول ہی جائے راہی۔

چودہ مئی کی رات

اب کچھ نہ رہا، مٹی میں ملا، جو دھن تھا پاس وہ دُور ہوا،
وہ دھن بھی دھیان کی موج ہی تھی، مچلی، ابھری، ڈوبی، کھوئی؛
وہ پہلی، اچھوتی سندرتا نیند آ ہی گئی اُس کو، سوئی،
ناداں جوان مرے دل کا — نشہ تھا نیا — مخمور ہوا،
اک گیان کی موج اٹھی — تیکھی، اچپل، البیلی سی ناری،
جو بات بتائی اُس نے مجھے وہ بات لگی دل کو پیاری۔

کچھ سوچ نہیں، کچھ سوچ نہیں، کیوں سوچ میں کھوئے دل میرا؟
کیوں اپنے لہو کی بوندوں سے آنکھوں کو دھوئے دل میرا؟
اب رنگ لہو کا اور ہوا، اب رنگ لہو کا اور ہوا،
ٹیسو کی کلیاں مرجھائیں، اک کھیت کپاس کا پھولا ہے،
جو سوچ کرے تو گیانی نہیں، اگیانی ہے من بھولا ہے۔

اس دنیا کی ریت ہے یہ ناداں، ہر بات بدلتی رہتی ہے۔
رُت آتی ہے، رُت جاتی ہے، یوں وقت کی ندی بہتی ہے۔

بچپن آیا، کیسا تھا سماں! جگ کی ہر بات نرالی تھی،
من اپنا بھولا بھالا تھا، سب دنیا بھولی بھالی تھی:
پھر من کی دھارا پھوٹ بہی، میٹھی رُت آئی جوانی کی،
من میں تھیں اُمنگیں پریتم کی، آشائیں پریم کہانی کی،
یہ دنیا ایک شکاری تھی، کیا جال بچھایا تھا اس نے!
دو روز میں ہم نے جان لیا، سکھ اور رکا ہے اور دُکھ اپنا،
سنجوگ کے دن گنتی میں نہیں اور پریم کی راتیں ہیں سپنا۔
یہ دنیا اک بیوپاری تھی، کیسا بہکایا تھا اس نے!
من جال میں پھنس کر جب تڑپا، جھنجلا اُٹھا، جھنجلا اُٹھا،
اک رات کے جادو میں کھو کر پھر آیا جوانی کا ریلا،
دل میں اُلجھن تھی آنکھوں میں اک رنگ لہو سا چھایا تھا،
دو دل کو مدماتے ہو کر دیکھا ہم نے۔ ٹوٹا میلا،
گن گیان کی چنچل موج اُٹھی: بس جگ میں جیون، دو دن کا:
اب من کو کیسے سوجھ آئے: انجانی ہولی کیوں کھیلا!

لبِ جوئبارے

ایک ہی پل کے لیئے بیٹھ کے پھر اُٹھ بیٹھی
آنکھ نے صرف یہ دیکھا کہ نشستہ بُت ہے۔
یہ بصارت کو نہ تھی تاب کہ وہ دیکھ سکے
کیسے تلوار چلی۔ کیسے زمیں کا سینہ
ایک لمحے کے لئے چشمے کی مانند بنا۔

پیچ کھاتے ہوئے یہ لہر اُٹھی دل میں مرے
کاش! یہ جھاڑیاں اک سلسلۂ کوہ بنیں۔
دامن کوہ میں مَیں جا کے ستادہ ہو جاؤں۔
ایسی انہونی جو ہو جائے تو کیوں یہ بھی نہ ہو
خشک پتّوں کا زمیں پر جو بچھا ہے بستر
وہ بھی اک ساز بنے — ساز تو ہے، ساز تو ہے،
نغمہ بیدار ہوا تھا جو ابھی، کان ترے
کیوں اُسے سُن نہ سکے؟ سننے سے مجبور رہے

پردۂ چشم نے صرف ایک نشستہ بُت کو
ذہن کے دائرۂ خاص میں مرکوز کیا۔

یاد آتا ہے مجھے — کان ہوئے تھے بیدار
خشک پتّوں سے جب آئی تھی تڑپنے کی صدا،
اور دامن کی ہر اک لہر چمک اٹھی تھی،
پڑ رہا تھا اُسی "تلوار" کا سایہ شاید
جو نکل آئی تھی اک پل میں نہاں خانے سے
جیسے بے ساختہ انداز میں بجلی چمکے

لیکن اُس دامنِ آلودہ کی ہر لہر مٹی۔
جل پری دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہوئی،
میں ستادہ ہی رہا، میں نے نہ دیکھا (افسوس!)
کیسے تلوار چلی، کیسے زمیں کا سینہ
ایک لمحے کے لئے چشمے کی مانند بنا۔

دامنِ کوہ میں استادہ نہیں ہوں اس وقت

جھاڑیاں سلسلۂ کوہ نہیں، پردہ ہیں
جس کے اُس پار جھلکتا نظر آتا ہے مجھے
منظرِ انجان، اچھوتی سی دُلھن کی صوُرت

ہاں، تصوّر کو میں اب اپنے بنا کر دُولھا
اسی پردے کے نہاں خانے میں لے جاؤں گا،
کیسے تلوار چلی، کیسے زمیں کا سینہ
دلِ بے تاب کی مانند تڑپ اٹھا تھا!
ایک بے ساختہ انداز میں، بجلی کی طرح
جل پری گوشۂ خلوت سے نکل آئی تھی!
زندگی گرم تھی ہر بوند میں آبی پاؤں
خشک پتّوں پہ پھسلتے ہوئے جا پہنچے تھے!
میں بھی موجود تھا — اک کربِ بے نام و نشاں
میں نے دیکھا کہ گھٹا شق ہوئی، دھار اُبلی،
برق رفتاری سے اک تیر کماں نے چھوڑا،
اور وہ خم کھا کے، لچکتا ہوا تھرا کے گرا
قلۂ کوہ سے گرتے ہوئے پتھر کی طرح
کوئی بھی روک نہ تھی اُس کے لئے، اُس کیلئے

خشک پتوں کا زمیں پر ہی بچھا تھا بستر،
اُسی بستر پہ وہ انجان پری لیٹ گئی!

اور میں، کرمکِ بے نام، گھٹا کی صُورت
اِسی اُمّید میں تکتا رہا، تکتا ہی رہا!
اب اُسی وقت کوئی جل کی پری آ جائے،
بنسری ہاتھ میں لے کر میں گوالا بن جاؤں!

جل پری آئے کہاں سے؟ وہ اُسی بستر پر
میں نے دیکھا، ابھی آسودہ ہوئی، لیٹ گئی؛
لیکن افسوس کہ میں اب بھی کھڑا ہوں تنہا،
ہاتھ آلودہ ہے، نمدار ہے، دھندلی ہے نظر،
ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو تو نہیں پونچھے تھے!

عکس کی حرکت

کچھ رنگ کا نور، کچھ آوازیں، کچھ سائے، — دھندلکے کا پردا،
— اور مجھ کو جھجک ہے، کیسے کہوں، سننے والے جھلائیں گے،
اک مورت ہے، میٹھی، من موہنی صورت ہے
انمول بدن، اک چندر کرن — لہراتی ہے،
بہتی ندی — بل کھاتی ہے،
اک پل کو دکھائی دیتی ہے
پھر آنکھ جھپکتے ہیں اوجھل ہو جاتی ہے،
حیران ہوں کیسا جادو ہے،
یا میری آنکھ میں آنسو ہے،
آنسو ہے دھندلکے کا پردا —
کچھ سائے ہیں، کچھ آوازیں، کچھ رنگ کا نور بھی لرزاں ہے،
اور مجھ کو جھجک ہے، کیسے کہوں، سننے والے جھلائیں گے؛

کیا دھیان آیا، کیا دھیان آیا؟

کیوں آنکھ جھکی، دل شرمایا؟
تیری پُوجا کے مندر کی مورت ٹوٹی، جُگ بیت چُکے
اب ہارنے والے ہار چُکے اور جیتنے والے جیت چُکے،
کیا سوکھی بھیگی کہانی میں اُس رَنگ سے موہنی آ جاتی —
وہ رنگ کا نُور، وہ آوازیں، وہ سائے، وہ پروا — دھندلا!؟

دھندلا پردا پیراہن ہے
ساری کا رسیلا دامن ہے
رہ رہ کے لرزتا جاتا ہے
رُک رُک کے مچلتا جاتا ہے
اک سایہ اُن آوازوں کی
اُجلی، نورانی کہانی کو
کہہ کہہ کے لرزتا جاتا ہے،
اور آگے نکلتا جاتا ہے،
اور مجھ کو جھجک ہے کیسے کہوں!
خاموش رہوں، دکھ درد سہوں یہ بات نہیں میرے بس کی،
کیوں جاگتی ہیں لہریں رس کی!
اِن زہری پھولوں کو کون چُنے!

دُکھ درد کی بات نہ کوئی سنے ۔
ہاں، مجھ کو جھجک ہے ، کیسے کہوں سُننے والے جھلّائیں گے ؛
خاموش رہوں، چُپ چاپ سہوں، بہتا جاؤں ۔
اِک ندی میں بہتا جاؤں،
بہتی ندی — بل کھاتی ہے ؛
لہراتی ہے — اک چندر کرن ، انمول بدن ،
میٹھی ، من موہنی صورت ہے ،
چنچل ، متوالی مورت ہے ،
کچھ رنگ ، کا نو ، کچھ آوازیں ، کچھ سائے لرزتے جاتے ہیں ،
اور لمحے گذرتے جاتے ہیں ، اور لمحے گذرتے جاتے ہیں !

شام کو، راستے پر

رات کے عکسِ تخیّل سے ملاقات ہو جس کا مقصود
کبھی دروازے سے آتا ہے، کبھی کھڑکی سے،
اور ہر بار نئے بھیس میں در آتا ہے۔
اُس کو اک شخص سمجھنا تو مناسب ہی نہیں،
وہ تصوّر میں مرے عکس ہے ہر شخص کا، ہر انساں کا،
کبھی بھر لیتا ہے اک بھولی سی محبوبۂ ناداں کا بہروپ، کبھی
ایک چالاک، جہاں دیدہ و بے باک ستمگر بن کر
دھوکا دینے کے لیے آتا ہے، بہکاتا ہے،
اور جب وقت گذر جائے تو چھپ جاتا ہے۔

مری آنکھوں میں مگر چھایا ہے بادل بن کر
ایک دیوار کا روزن، اسی روزن سے نکل کر کرنیں
مری آنکھوں سے لپٹتی ہیں، مچل اٹھتی ہیں
آرزوئیں دلِ غم دیدہ کے آسودہ نہاں خانے سے،

اور میں سوچتا ہوں نور کے اِس پردے میں
کون بے باک ہے، اور کھوئی سی محبوبہ کون؟
سوچ کو روک ہے دیوار کی، وہ کیسے چلے؟
کیسے جا پہنچے کسی خلوتِ محجوب کے مخمور صنم خانے میں؟
وہ صنم خانہ جہاں بیٹھے ہیں دو بُت —— خاموش،
اور نگاہوں سے ہر اک بات کہے جاتے ہیں،
ذہن کو اُن کے دھندلکے نے بنایا ہے اک ایسا عکاس
جو فقط اپنے ہی من مانے مناظر کو گرفتار کرے،
میں کھڑا دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں، جب دونوں
چھوڑ کر دل کے صنم خانے کو گھر جائیں گے،
صحن میں تلخ حقیقت کو کھڑا پائیں گے،
ایک سوچے گا مری جیب، یہ دنیا، یہ سماج،
ایک دیکھے گا وہاں اور ہی تیاری ہے،

مجھ کو اُلجھن ہے یہ کیوں، میں تو نہیں ہوں موجود
رات کی خلوتِ محجوب کے مخمور صنم خانے میں؛
مری آنکھوں کو نظر آتا ہے روزن کا دُھواں

اور دل کہتا ہے یہ دُود دلِ سوختہ ہے ،
ایک گھنگھور سکوں، ایک کڑی تنہائی

میرا اندوختہ ہے۔
مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ دنیا مٹ جائے ،
مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ بے کار سماج
اپنی پابندی سے دم گھٹ کے فسانہ بن جائے ،
مری آنکھوں میں تو ہر گوشہ ہے روزن کا سماں :
اپنی ہستی کو تباہی سے بچانے کے لئے
میں ابھی روزنِ بے رنگ میں گھس جاؤں گا ،
لیکن ایسے تو وہی بت نہ کہیں بن جاؤں
جو نگاہوں سے ہر اک بات کہے جاتا ہے ،
چھوڑ کر جس کو صنم خانے کی مجبوب فضا
گھر کے بے باک ، المناک سیہ خانے میں
آرزوؤں پہ ستم دیکھتا ہے ، گھُلتا ہے ،
میں تو روزن میں نہیں جاؤں گا ، دنیا مٹ جائے
اور دم گُھٹ کے فسانہ بن جائے
سنگدل ، خون سُکھاتی ہوئی بے کار سماج ،

میں تو اک دھیان کی کروٹ لے کر
عشق کے طائرِ آوارہ کا بہروپ بھروں گا پل میں،
اور چلا جاؤں گا اس جنگل میں
جس میں تُو، چھوڑ کے اِک قلبِ فسردہ کو اکیلے، چل دی،
راستہ مجھ کو نظر آئے نہ آئے، پھر کیا
اَن گنت پیڑوں کے میناروں کو
میں تو چھوتا ہی چلا جاؤں گا،
اور پھر ختم نہ ہو گی یہ تلاش،
جستجو روزنِ دیوار کی مرہون نہیں ہو سکتی،
میں ہوں آزاد ـــــ مجھے فکر نہیں ہے کوئی،
ایک گمنام سکوں، ایک کڑی تنہائی
مرا اندوختہ ہے۔

اُفتاد

اپنے اک دوست سے ملنے کے لئے آیا ہوں ،
ایک دو بار تو زنجیر ہلائی میں نے
لیکن آواز کوئی آئی نہیں ؛
گھر پہ موجود نہیں ! — سویا ہُوا ہے ، دن میں ؟
اور اک بار ہلاؤں زنجیر ؟
چھیڑ دوں سوئی گلی میں وہی گستاخ صدا
راہ تکتے ہوئے جس پر مجھ کو
رات میں بھونکتے کتّے کا گماں ہوتا ہے ؟
لیکن اک لمحہ ٹھہر جاتا ہوں
سوچتا ہوں کوئی بھولی بھٹکی
سرِ کوچہ سے نکل آئے گی۔
خمِ دیوار پہ سیّارے کی مانند رواں
اور اک لمحہ گذر جائے گا اُس منظرِ رنگین کے جلوے کا تماشا کرتے
ایک پل ایسے بھی کٹ جائے گا۔

لیکن افسوس! مرے سامنے دروازہ ہے
راہ تکنا ہی مقدر میں لکھا ہے شاید۔

ایک دروازے میں کیا راز کی باتیں ہیں نہاں
ابھی کھولوں ــــ کوئی ان دیکھی، انوکھی صورت
سامنے بُت بنی، استادہ نظر آجائے،
اور شاید کسی جلتے ہوئے دروازے کا تختہ یہ المناک حقیقت سمجھائے
ابھی دہلیز کو کرتے ہوئے پار
زندگی سے تری افسوس! ہمیشہ کے لئے،
کوئی رخصت ہوا، رخصت ہوا، معدوم ہوا ــــ عدم
بند ہوتا ہوا، کھلتا ہوا دروازہ ہے!
ہاں، یہی منظرِ لبریزِ بلاغت اب تو
آئینہ خانے میں آنکھوں کے جھلکتا ہے مدام۔

بند ہوتا ہوا دروازہ نظر آتا ہے
بند ہوتے ہوئے دروازے کے پردے میں مجھے
پھیلتی وسعتِ چالاک نے بہکایا ہے۔

یہی وسعت مرے ماضی کے گھروندے میں بھی ہے،
مگر اک مرکزِ بے نام و نشاں بن، خاموش
ایک دلہن سی لجاتی ہوئی، شرماتے ہوئے بل کھاتی،
اور سمٹی چلی جاتی ہوئی مرکز کی طرف۔

گرم بستر پہ تڑپتا ہوا دل بول اٹھا
بند ہوتے ہوئے دروازے کے جادو نے مجھے
پھیلتی وسعتِ نمناک میں الجھایا ہے۔

پھیلتی وسعتِ نمناک سے اک دامِ خیال، ——
بند ہوتا ہوا دروازہ کسی کالے کی بین بنتا ہے،
بین سے تیر کے پھل کی طرح تھراتی ہوئی
زخم کو داغتی ہوئی تیکھی صدا آتی ہے
جس میں پوشیدہ ہے، آسودہ ہے سمِ قاتل
لیکن احساسِ سماعت ہی نہ تھا مجھ کو مرے کانوں میں
ایک ہی گونجتی، جھلاتی ہوئی تلخ صدا آتی تھی۔
بند ہوتا ہوا دروازہ مرے سامنے کیوں آیا ہے!

بین کے نغمے سے چونکا، اُٹھا،
پھن کو پھیلائے ہوئے جھُومنے، لہرانے لگا
آنکھ تو سُست ہے، اب بھی اُسی منظر کی طرف مائل ہے،
اور بوسیدہ، فتادہ تختے
بازوؤں کی طرح کھلتے ہیں، —— لپٹ جاتے ہیں۔
گرم بستر پہ پڑی، لیٹی ہوئی، بیسوا دہلیز کی گردن میں حمائل ہو کر،
جو بھی آ پہنچے بس اُس کے پاؤں
روندتے روندتے دہلیز کو بڑھ جاتے ہیں،
اور پھر تیرگی —— نادان کا جاہل کا دماغ ——
جس میں بھرائی ہوئی سرد صدا گونجتی ہے،
جسم کے نور کو کھا جاتی ہے۔
اور بوسیدہ، فتادہ تختے
چُوستے ہونٹوں کی مانند مِرے گرم لہو کو پل میں
اپنی رگ رگ میں سمو لیتے ہیں، چلاتے ہیں،
ایک وحشت کے فسوں میں کھو کر
میں بھی بن جاتا ہوں اک چیخ —— المناک صدا!
تیر کے پھل کی طرح چھُوٹ کے تھراتی ہوئی!

اب خلش، درد، تڑپ، رسوائی
بند ہوتے ہوئے، کھلتے ہوئے دروازے ہیں!

محبوبہ کا سایہ

آکاش کے نیچے ساگر کا متوالا چاند ہے دل میرا
لیکن اب نور نہیں باقی، مرجھایا سپنا ہے دل میرا!
وہ نور کہ جس کی کرنوں کے سایوں سے دھندلکے بنتے تھے
بوجھل احساس مرے دل کے تج چھپنا کر ہلکے بنتے تھے
اب نور کے رنگ سا مٹے سارے، اب ایک اندھیرا چھایا ہے
اب تاریکی کے بندھن نے دکھ درد کا روپ دکھایا ہے

کیسا تھا سماں، جب سارا جہاں میری آنکھوں میں سمایا تھا
وہ سایہ تھی میں سایہ تھا، دونوں پر جادو چھایا تھا!
جیسے جنگل کے رکھوالوں کا اک جھرمٹ ڈر کر جاگ اٹھے
اور جیسے تیسے شکاری کا ہر تیر بھی نیند سے جاگ اٹھے!
سوکھے پتوں میں جنگل کے اختر اٹکے، جھنجھلا اٹھے
جنگل کی فضا کے گنبد میں ٹوٹے تاروں کی صدا اٹھے
یہ سارا منظر بھی اب تو میری آنکھوں میں سمایا ہے
اور یاد کے ساحل پر پانی کی جھاگ نے راج جمایا ہے

اس شہر کا ہر سُونا رستہ مجھ کو دھارا ہے ندی کی
ہر راہ سے یادِ تڑپ کے اٹھتی ہے پیاسا سکھ بیتی کی
شو کیس ہے اونچے محلوں کی ہر راہ کے دونوں کناروں پہ
اک منظرِ زخم بنتا ہے بکھر سا دل کے تاروں پر
منظر ہے محل کا، رستے کا، رستے پر ہی بنا ہے
چھت پر پیراہن لٹکا ہے، لہراتا ہے بل کھاتا ہے
اور سورج اپنے نور کے پیراہن کو سایہ بناتا ہے
دل گیت جیون کے ساگر کی شدت میں کھو جاتا ہے

وہ گیت بھی سایہ ہے اک میرے دل کے سمندر کا
اُس میں اُلفت کی صورت ہے اور گیت اشنان کے منظر کا
متوالی چپ نہ جلتا ہے، دل بہرا ہے، آگ لگی ہے
رستا ہے لہو ہر ... دل ... گیت کی بات
چھت پر پیراہن لٹکے ہیں رنگ اشنان میں کھوئی تھی
کیا بیتی رات وہ سکھ کی آج پر سایہ کسی کے سو گئی
یہ سوچ جگاتی ہے دل میں اک درد کے بہت جادو کو
اور گیت کے درد کا منظر خون بنا دیتا ہے آنسو کو
منظر ہے محل کا، رستے کا، رستے پر ہی بنا ہے

چھت پر پیراہن لٹکا ہے، لہراتا ہے، بل کھاتا ہے
اور درد کا پنچھی تنگ آکر اک ڈالی پر رُک جاتا ہے
دل گیانی ہے رنگوں کا یہ بات نئی سمجھاتا ہے
"یہ پیراہن آنے والی میٹھی متوالی راتوں میں!
تیرے گاتوں کو سہلائے گا — سیج کی اُن برساتوں میں
کچھ دھیان نہ آس کا آئے گا! پھلواری میں سو بھنورے تھے
انمول بدن تھا پیتم کا۔ سولہ سنگار سے سنورے تھے
سب انگ اچھوتے، ان دیکھے اور سُکھ کی سیج سہانی تھی
اوروں کے لئے تو جا بلا تھا، پریمی کو دُکھ کی کہانی تھی

یہ دل کی بات لگی پیاری، میں دھیان کی دُھن میں ڈوب گیا
دُکھ درد مٹا، میدان میں ہارا، دور ہوا — محجوب گیا!
لیکن یہ رنگ خیالوں کے اب میری نظر میں سایہ ہیں
سب بیتی رات کا جادو ہیں، سب پچھلے جنم کی مایا ہیں

بعد کی اُڑان

چُوم ہی لے گا، بڑا آیا کہیں کا، ___ کوّا،
اُڑتے اُڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا،
کلموا، کالا کلوٹا، کاجل ___
میں اگر مرد نہ ہوتا تو یہ کہتا تجھ سے!

دوش پر بکھرے ہوئے ہیں گیسو،
بِندی وُمدار ستارہ ہے مگر ساکن ہے،
چلتے چلتے کوئی رُک جائے اچانک جیسے،
غسل خانے میں نظر آیا تھا انگلی پہ مجھے سُرخ نشاں،
وہی دُمدار ستارے کی نمائش کا پتہ دیتا تھا،
آپ ناپید ہوا ہے مگر اپنے پیچھے
کسی نقشِ کفِ پا کی صورت
رات کے راستے میں چھوڑ گیا ہے وہ کہانی جس کو
سُننے والا یہ کہے گا مجھ سے

گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اک تان کی حاجت ہی نہ تھی،
ایسی ہی ایک لرزتی ہوئی تان آئی تھی
جب پھسلتے ہوئے مایوس لرزتے ہوئے جا پہنچے تھے
فرش پر، ایک سہری کے کٹہرے پہ ہوا آویزاں
"چھوڑ دو، رہنے دو ـــــ اس کو تو یہیں رہنے دو"
نیم وا آنکھوں کو پھر بند کیا تھا اس لئے
ہاتھ بھی آنکھوں کے پردوں پہ رکھے تھے یکدم
اور اب ایک ہی پل میں یہ اگر کھل جائیں
یہی آنکھیں جو مجھے دیکھ نہیں سکتی تھیں
دیکھتے دیکھیں تجھے، ـــــ ہاتھ کہاں رکھیں گی؟
دیکھ سکیں گی ـــــ وہی ایک نشانِ منزل
جس جگہ آ کے ازل اور ابد ایک ہوئے تھے دونوں،
ایک ہی لمحہ بنے تھے مل کر،
بس تجھے ہی یہ بندی مجھے دھندلا ستارہ سا نظر آئی تھی،
ات کے راستے میں چھوڑ گئی تھی وہ کہانی جس کو
سنتے ... کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اک تان کی حاجت ہی نہ تھی۔

اب لرزتے ہوئے ملبوس نظر آتے نہیں ہیں، لیکن
اُن کی آنکھوں کو ضرورت بھی نہیں
وہ تو اک رات کے طوفان کا اعجاز تھا، طوفان تھا،
کیسا طوفان تھا! — اندھا طوفان،
جس کے مٹنے پہ مجھے نوح کی یاد آتی ہے
اور پھر نوح نے بیٹوں سے کہا
کھول دو پنجرا، اسے چھوڑ دو — اس فاختہ کو
جا کے خشکی کا پتا لے آئے،
چند لمحوں ہی میں وہ فاختہ لوٹ آئی، مگر ناکامی
اُس کی قسمت میں لکھی تھی،
اور پھر کوّے کو چھوڑا، یہ بھی خشکی کا پتہ لائے گا،
اُڑتے اُڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا
جھوم ہی لے گا، بڑا آیا کہیں کا کوا،
کلمُوا، کالا کلوٹا، کاجل!

دل کے روپ میں رات کہانی

رات کے پچھلے اندھیرے میں کوئی سایہ نہیں،
ٹمٹماتے ہوئے کمزور ستارے یہ کہے جاتے ہیں
چاند آئے گا تو سائے بھی چلے آئیں گے
رات کے پچھلے اندھیرے میں کوئی سایہ نہیں ہوتا ہے،

رات اک بات ہے صدیوں کی، کئی صدیوں کی
یا کسی پچھلے جنم کی ہوگی۔
رات کے پچھلے اندھیرے میں کوئی سایہ نہ تھا
رات کا گہرا اندھیرا — سنسان۔
اک بھکاری تب اُسی پہلی کرن کا جو لرزتے ہوئے آتی ہے جگا دیتی ہے
سوئے سایوں کو اٹھا دیتی ہے، بیداری میں
زیست کے چلتے ہوئے، چھوٹتے آثار نظر آتے ہیں۔
زیست سے پہلے مگر بات کوئی اور ہی تھی
رات کے پچھلے اندھیرے میں کوئی سایہ نہ تھا۔

چاند کے آنے پہ سائے آئے —

اس کے بکھرے ہوئے گیسو سائے ،
لاج کی میٹھی جھجک بھی سایہ ،
اور بھی سائے تھے — ہلکے ، گہرے ،
کالی آنکھوں کی گھنیری پلکیں
اپنے آغوش میں سایوں کو لئے بیٹھی تھیں ،
اور اُن سایوں میں محسوس ہوا کرتا تھا
دل کا غم ، دل کی خلش ، دل کی تمنا ...... ہر شَے
ایک سایہ ہے ، لرزتا سایہ ۔
اور مجھے دیکھنے پر اُس کی گھنیری چُپ چاپ
ایک سایہ ہی نظر آتی تھی
ایسا اک سایہ جو خاموش رہا کرتا ہو ،
اور اُسے دیکھنے ہی میں بھی تو اک سایہ ہی بن جاتا تھا ، — —
سایہ خاموش رہا کرتا ہے ،
اور اک لرزشِ بے تاب کے ہوتے پہ بھی خاموشی رہی
راہ میں میری جنازہ گیسو ہوا کرتی تھی ۔

سیدھا جاتا ہوا رستہ بھی تو اک سایہ تھا،
اس پہ آتے ہوئے جاتے ہوئے انسان — تمام
دھندلے سائے تھے، مگر سائے تھے۔
میں بھی جاتا ہوا، آتا ہوا اک سایہ تھا،
میں بھی اک سایہ تھا؟ — کس کا سایہ؟
کس کے قدموں سے لپٹتے ہوئے چپ چاپ چلا جاتا تھا!
کہہ تو دوں، — دل میں یہ غمناک خیال آتا ہے
سایہ خاموش رہا کرتا ہے۔

رات کے سائے ہی خاموش رہا کرتے ہیں
دن کے سائے تو کہا کرتے ہیں
جیتی لذت کی کہانی سب سے
اور مرا جسم بھی اب دن کا ہی اک سایہ ہے
جس نے ہر ایک ذرّے کو شعاعِ سوزاں
اپنی شدت سے جلانے پہ تمنا سے یہ تُلی بیٹھی ہے۔
کاش اب کے گھٹا چھائے گھٹا — اور بن جائے
چڑھتے سورج کا زوال۔

چڑھتا سورج یہ بتا دیتا ہے
بڑھتے سائے ہیں کسی کے غماز
بڑھتے بڑھتے یہ گھٹے جاتے ہیں۔
رات کے جاگے ہوئے سوئے ہوئے اٹھے ہیں
دھوپ کھاتے ہوئے لٹکے
جب کوئی پیرہن آویزاں
ایک جھونکے سے لرز اٹھتا ہے
ہمنوائی کو لرزتا ہوا سایہ بھی کہے جاتا ہے
بیتی لذت کی کہانی سب سے۔

بیتی لذت بھی بس واسطے اک سایہ ہے
گرم سورج کے تلے آتے ہوئے بادل کا
سنسناتے ہوئے جھونکے کی طرح آتا ہوا جاتا ہوا —
پانی گرنے کو وہ اک پل بھی نہیں رکتا تھا۔
دن کا سایہ کہ تھا اس سے رات کی اک بات بھی معلوم نہ تھی۔
رات اک بات ہے صدیوں کی، کئی صدیوں کی
اور اب دن ہے — مجھے سائے نظر آتے ہیں

بولتے سائے نظر آتے ہیں،
جانے پہچانے ہیں، پھر بھی نئے مفہوم سمجھاتے ہیں، سمجھاتے ہی چلے جاتے ہیں،
پھر پلٹ آتے ہیں،
جیسے میں جاتا تھا اور جا کے پلٹ آتا تھا
اُسی رستے پہ جو اک سایہ تھا۔

راستہ آج بھی سایہ ہے مگر ایک نیا سایہ ہے،
راہ میں ایک مکان۔
وہ بھی سایہ ہے اُداسی کا، گھنیرا سنسان،
راہ میں آتی ہوئی ہر مورت
ایک سایہ ہے — چڑیل،
خود کا اُس میں کوئی عکس نظر آتا نہیں،
دیکھتے ہی جسے میں کانپ اُٹھا کرتا ہوں،
آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے
سامنے دھند سی چھا جاتی ہے
دل دھڑکتا ہی چلا جاتا ہے
اور میں دیکھتا ہوں

سائے ملتے ہوئے، گھلتے ہوئے کچھ بھوت سے بن جاتے ہیں،
منہناتے ہوئے ہنستے ہیں، پکار اُٹھتے ہیں
دل میں کیا دھیان یہی ہے اب بھی
سایہ خاموش رہا کرتا ہے!
دیکھ ہم بولتے ہیں، بولتے سائے ہیں تمام،
ہم سے بچ کر تو کہاں جائے گا؟
اور میں کانپ اٹھا کرتا ہوں

اور وہ بولتے ہیں
کانپ اٹھا ہے، لرزتا ہے یہ بزدل، ناکام،
بات کرتا ہی نہیں ہے کوئی،
اب بھی شاید یہ سمجھتا ہے لرزتے دل میں
سایہ خاموش رہا کرتا ہے۔

کلرک کا نغمۂ محبت

سب رات مری سپنوں میں گذر جاتی ہے اور میں سوتا ہوں
پھر صبح کی دیوی آتی ہے،
اپنے بستر سے اٹھتا ہوں، منہ دھوتا ہوں،
لایا تھا کل جو ڈبل روٹی
اُس میں سے آدھی کھائی تھی
باقی جو بچی وہ میرا آج کا ناشتہ ہے:

دنیا کے رنگ انوکھے ہیں
جو میرے سامنے رہتا ہے اُس کے گھر میں گھر والی ہے۔
اور دائیں پہلو میں اک منزل کا ہے مکاں، وہ خالی ہے،
اور بائیں جانب اک عیّاش ہے جس کے ہاں اک داشتہ ہے:
اور ان سب میں اک میں بھی ہوں لیکن بس تُو ہی نہیں۔
ہیں اور تو سب آرام مجھے، اک گیسوؤں کی خوشبو ہی نہیں۔

فارغ ہوتا ہوں ناشتے سے اور اپنے گھر سے نکلتا ہوں
دفتر کی راہ پہ چلتا ہوں،
رستے میں شہر کی رونق ہے، اک تانگہ ہے، دو کاریں ہیں،
بچے مکتب کو جاتے ہیں، اور تانگوں کی کیا بات کہوں؟
کاریں تو چھلچلتی بجلی ہیں، تانگوں کے تیوروں کو کیسے بھولوں!
یہ مانا ان میں شریفوں کے گھر کی دھن دولت ہے، مایا ہے،
کچھ شوخ بھی ہیں، معصوم بھی ہیں،
لیکن رستے پر پیدل مجھ سے بدقسمت مغموم بھی ہیں،
تانگوں پہ برق تبسم ہے،
باتوں کا میٹھا ترنم ہے،
آکاش تلے وتیبان پہ رہ کر؛ قدرت کے دل میں ترحم ہے:
ہر چیز تو ہے موجود یہاں اک تو ہی نہیں، اک تو ہی نہیں،
اور میری آنکھوں میں رونے کی ہمت ہی نہیں، آنسو ہی نہیں!

جوں توں رستہ کٹ جاتا ہے اور بندی خانہ آتا ہے،
چل کام میں اپنے دل کو لگا یوں کوئی مجھے سمجھاتا ہے،
میں دھیرے دھیرے دفتر میں اپنے دل کو لے جاتا ہوں

نادان ہے دل، مورکھ، بچہ — اک اور طرح دے جاتا ہوں،
پھر کام کا دریا بہتا ہے اور ہوش مجھے کب رہتا ہے،

جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپراسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے، ووں کہتا ہے لیکن بے کار ہی رہتا ہے۔
میں اس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں، تھک جاتا ہوں،
پل بھر کے لئے اپنے کمرے کو فائل لینے آتا ہوں،
اور دل میں آگ سلگتی ہے : میں بھی جو کوئی افسر ہوتا
اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا بھی گھر ہوتا۔
اور تو ہوتی!
لیکن میں تو اک منشی ہوں تو اونچے گھر کی رانی ہے
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے!

سرسراہٹ

یہاں ـــــ ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھ دوں!
یہ لہروں میں بہی جاتی ہیں اور مجھ کو بہاتی ہیں،
یہ موجِ بادہ ہیں ساغر کی خوابیدہ فضاؤں میں
اچانک جاگ اٹھتی ہے،
حقیقت کے جہاں سے کوئی اس دنیا میں در آئے
تو اس کے ہونٹ متبسم ہوں۔ شاید قہقہہ اٹھ کر
مرے دل کو جکڑ لے اپنے ہاتھوں سے،
مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ لہریں ابھی تک ساحلی منظر سے ناواقف ہیں، یونہی اک بہانہ
کر رہی ہیں اک بہانہ کس کو کہتے ہیں؟

بہانے ہی بہانے ہیں،
بڑھا کر رکھ دیا لہروں پہ میں نے ہاتھ ـــــ مرا ہاتھ اک کشتی کی مانند ایک موجِ تُند
کی اُفتاد کے جلوے کو مرے سامنے لا کر ـــــ

ہوا ہے گُم،
یہ سب موجِ تخیّل کی روانی تھی......

مگر میں سوچتا ہوں بات جو کہنے کی تھی میں نے نہ کیوں پہلے ہی کہہ دی — وقت کا
بے فائدہ مصرف
ہر اک پوشیدہ منظر کو
اُگل ڈالے گا، اک لمحہ وہ آئے گا

کہ جب اس بات کے سُننے پہ سننے والے سوچیں گے
یہ نہ کیا تھا، سلوٹ کیا تھی، موجِ باد بھی کیا تھی۔
مگر شب کی اندھیری خلوتِ گمنام کے پردے میں کھو کر ان کو یہ معلوم ہو جائے گا اک پیاس
اور اک لذت کے کیفِ مختصر میں کھو کے وہ بے ساختہ یہ بات کہہ اٹھیں گے: "کیا
مجھ کو اجازت ہے"،
"یہاں ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھ دوں؟" —— "یہ جھجک کیسی؟
یہ لہریں ہیں، انہیں نسبت ہے کالی رات کے غمناک دریا سے
جو بہتا ہی چلا جاتا ہے، رکتا ہی نہیں پل کو
تجھے کچھ بھی غرض اس سے نہیں میں ہاتھ رکھوں یا جھجک اس ہاتھ کو میرے
کلیجے سے لگا دے، اور میں سو جاؤں ان لہروں کے بستر میں"۔

نادان

یہ کیسے منظر ہیں، کیسی باتیں ہیں مجھ سے جو کہنا چاہتی ہو!
سرود میں نے سُنے ہیں پیڑوں کی ٹہنیوں سے
لچکتے نغمے،
فلک پہ بہتے ہیں بادلوں کے جو ننّھے ٹکڑے
پھسلتے نغمے،
ہوا کے جھونکوں سے میرے کانوں نے سُن رکھے ہیں
مچلتے نغمے،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

ہوا سے بادل کے چند ٹکڑے بہے چلے جا رہے تھے، میں نے
اُنہیں جو دیکھا تو میرے دل میں جھجکتی آشا نے آہ بھر کر
کہا کہ یہ کیسی بات مجھ سے کہے چلا جا رہا ہے بادل؟
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

مری نگاہوں نے شرم سے جھک کے دیکھا بہتی ہے ایک ندی
اور اس میں لہریں اور اُس میں کچھ بلبلے سناتے ہیں اک اچھوتا، عجیب نغمہ،
سرود میں نے سنے نغمے پتوں سے، شاخ سے، ابر سے، ہوا سے
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

میں تنگ آ کر اُٹھا اور اُٹھ کر چلا، اُسی غم کدے میں پہنچا
مجھے جو دے کر گیا تھا ندی کی پھیلی پھیلی کھلی فضا میں
مگر وہاں بھی وہی تھے بادل سیاہ، تاریک، چپ ہٹیلے
[illegible] بھری اداس باتوں کی، بلبلے تھے کسی میں کوئی
نہ تھا [illegible] ۔
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔
میں دیکھ کر ان کو پوچھتا ہی رہا کہ آخر یہ بھید کیا ہے
یہ کیسے منظر ہیں کیسی باتیں ہیں، مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔

محرومی

میں کہتا ہوں تم سے اگر شام کو بھول کر بھی کسی نے کبھی کوئی دھندلا ستارہ نہ دیکھا،
تو اس پر تعجب نہیں ہے، نہ ہوگا،

زماں سے اسی وضع کی پابند ہے شام کی خامشی بے ضرر، شوخ ناگن،
ابھرتے ہوئے اور لچکتے ہوئے اور مچلتے ہوئے کہتی جاتی ہے "آؤ مجھے دیکھو میں نے
تمہارے لئے ایک رنگین محفل جمائی ہوئی ہے۔

انوکھا سا ایوان ہے، ہر طرف جس میں پردے گرے ہیں، وہاں جو بھی ہو اس کو
کوئی نہیں دیکھ سکتا۔
تہیں اس کے پردوں کی ایسے لٹکتی چلی جاتی ہیں جیسے پھیلی ہوئی سطح دریا نے
اٹھ کر دھندلکے کی مانند پنہاں کیا ہو فضا کو نظر سے۔
ذرا دیکھو، چھت پر لٹکتے ہیں فانوس، ان ہی ہر اک نیم روشن کرن سے سجھاتے
ہیں اک بھید کی بات کا گیت جس میں مسہری کے آغوش کی لرزشیں ہوں،
ستونوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ رکتا ہوا اور جھجکتا ہوا جو سایہ یہی کہہ رہا
ہے: وہ آئے، وہ آئے!

ابھی ایک پل میں اچانک یونہی جگمگانے لگے گا یہ ایوان یکسر،

ہر اک چیز کیسے قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔
میں کہتی ہوں مانو، چلو —— آؤ، محفل سجی ہے،
تم آؤ تو گونج اُٹھے شہنائی، دالان میں آنے جانے کی آہٹ سے ہنگامہ پیدا
ہو، لیکن مسہری کے آغوش کی لرزشوں میں تمہیں اس کا احساس
بھی ہونے پائے تو ذمہ ہے میرا،
ازل سے اسی ڈھب کی پابند ہے موجِ بیتاب اس کو خبر بھی نہ ہوگی کہ اک شاخِ
نازک نے بے باک جھونکے سے ٹکرا کے آہیں بھری تھیں،
مگر میں یہ کہتا ہوں تم سے اگر شام کو بھول کر بھی کسی نے کبھی کوئی دھندلا ستارہ
نہ دیکھا تو اس پر تعجب نہیں ہے
ازل سے اسی ڈھب کی پابند ہے شام کی شوخ ناگن
یہ ڈستی ہے، ڈستے ہوئے کہتی جاتی ہے —— جاؤ! اگر تم جھجکتے رہو گے تو
ہر لحظہ یکساں روش سے گزر جائے گا اور تم دیکھتے ہی رہو گے اکیلے۔
تمہیں دائیں بائیں تمہیں سامنے کچھ دکھائی نہ دے گا فقط سرِ دیوار ہنستی رہیں گی
مگر ان کا ہنسنا بھی آہستہ آہستہ بیتے زمانے کی مانند اک دور کی بات معلوم ہونے لگے گا،
دھندلکے میں ڈوبی ہوئی آنکھ دیکھے گی روزن سے —— دُور اک ستارہ نظر آ رہا ہے،
مگر چھت پہ فانوس کا کوئی جھولا نہ ہوگا،
شکستہ، فتادہ ستونوں کی مانند فرشِ حزیں پر تمہارا وہ سایہ تڑپتا رہے گا جسے

یہ تمنا تھی ... کہہ دوں تمنا کیا تھی!

بس اب اپنی غمناک باتوں کو اپنے اُبھرتے ہوئے اور بدلتے ہوئے رنگ میں تو چھپا لے ،

میں اب مانتا ہوں کہ تو نے روانی میں اپنی بہت دور، روزن سے دھندلے

ستارے بھی دیکھے ہیں لاکھوں ،

میں اب مانتا ہوں مری آنکھ میں ایک آنسو جھلکتا چلا جا رہا ہے، ٹپکتا نہیں ہے ،

میں اب مانتا ہوں مجھے دائیں بائیں ، نہ مجھے سامنے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے ، فقط

یہ دیواریں ہنستی چلی جا رہی ہیں

میں اب مانتا ہوں کہ میں نے اس ایوان کو آج تک اپنے خوابوں میں دیکھا ہے لیکن

وہاں کوئی بھی چیز ایسے قرینے سے رکھی نہیں ہے ۔

کہ جیسے بتایا ہے تو نے تری ایک رنگین محفل سجی ہے ،

مسہری کے آغوش کی لرزشوں کا مجھے خواب بھی اب نہ آئے گا ___ میں اپنے

کانوں سے کیسے سنوں گا ۔ وہ شہنائی کی گونج ۔ ___ سیندور

کا سرخ نغمہ ، جسے سن کے دالان میں آنے جانے کی آہٹ

سے ہنگامہ ہو جاتا ہے ایک پل کو ،

مجھے تو فقط سرد دیواریں ہنستی سنائی دیے جا رہی ہیں ۔

جاتری

ایک آیا، گیا، دوسرا آنے گا، دیر سے دیکھتا ہوں، یونہی رات اس کی گذر جائیگی میں کھڑا ہوں یہاں کس لئے، مجھ کو کیا کام ہے، یاد آتا نہیں، یاد بھی ٹمٹماتا ہوا اک دیا بن گئی جس کی رُکتی ہوئی اور جھجکتی ہوئی ہر کرن بے صدا قہقہہ ہے مگر میرے کانوں نے کیسے اُسے سُن لیا ـــ ایک آندھی چلی، چل کے مِٹ بھی گئی، آج تک میرے کانوں میں موجود ہے سائیں سائیں مچلتی ہوئی اور اُبلتی ہوئی، پھیلتی پھیلتی، ـــ دیر سے میں کھڑا ہوں یہاں، ایک آیا، گیا، دوسرا آئے گا، رات اس کی گذر جائے گی، ایک ہنگامہ برپا ہے، دیکھیں جدھر آرہے ہیں کئی لوگ چلتے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے اور رُکتے ہوئے، پھر سے بڑھتے ہوئے اور لپکتے ہوئے، آرہے جا رہے ہیں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ـــ جیسے دل میں مرے دھیان کی لہر سے ایک طوفان ہے ویسے آنکھیں مری دیکھتی ہی چلی جا رہی ہیں کہ اک ٹمٹماتے دیے کی کرن زندگی کو پھیلتے ہوئے اور گرتے ہوئے ڈھب سے ظاہر کئے جا رہی ہے، مجھے دھیان آتا ہے اب تیرگی اک اُجالا بنی ہے، مگر اُس اُجالے سے رِستی چلی جا رہی ہیں وہ امرت کی بوندیں جنہیں میں ہتھیلی پہ اپنی سنبھالے رہا ہوں، ہتھیلی

مگر ٹمٹماتا ہوا اک دیا بن گئی تھی۔ پلک سے اُجالا ہوا۔ لو گری پھر اندھیرا سا چھانے لگا۔ بیٹھتا بیٹھتا بیٹھ کر ایک ہی پل میں اُٹھتا ہوا، جیسے آندھی کے تیکھے تھپیڑوں سے دروازے کے طاق کھلتے رہیں، بند ہوتے رہیں، ——— پھڑپھڑاتے ہوئے طائرِ زخم خوردہ کی مانند میں دیکھتا ہی رہا۔ ایک آیا، گیا، ——— دوسرا آئے گا، سوچ آئی مجھے، پاؤں بڑھنے سے انکار کرتے گئے، میں کھڑا ہی رہا۔ دل میں اک بوند نے یہ کہا رات یونہی گذر جائے گی۔ دل کی اک بوند کو آنکھ میں لے کے میں دیکھتا ہی رہا، پھڑپھڑاتے ہوئے طائرِ زخم خوردہ کی مانند دروازے کے طاق اک بار جب ہل گئے، مجھ کو آہستہ آہستہ احساس ہونے لگا ——— اب یہ زخمی پرندہ تڑپ نہ سکے گا، لیکن مرے دل کو ہر وقت تڑپائے گا، میں ہتھیلی پہ اپنی سنبھالے رہوں گا وہ امرت کی بوندیں جنہیں آنکھ سے میری بہنا تھا، لیکن مری زندگی ٹمٹماتا ہوا اک دیا بن گئی جس کی رکتی ہوئی اور جھجکتی ہوئی ہر کرن بے صدا قہقہہ ہے کہ اس تیرگی میں کوئی بات ایسی نہیں جس کو پہلے اندھیرے میں دیکھا ہو میں نے، سفر یہ اُجالے، اندھیرے کا چلتا رہا ہے تو چلتا رہے گا، یہی رسم ہے راہ کی۔ ایک آیا، گیا، دوسرا آئے گا، رات ایسے گذر جائے گی، ٹمٹماتے ستارے بتاتے تھے، رستے کی ندی بہی جا رہی ہے، بہے جا، اس اُلجھن سے اپنے نکل جا، کوئی سیدھا منزل پہ پہنچا تھا لیکن کئی تشنہ ہونٹ جا نہ پائے تھے انجم کے دو، بیگانہ کے مبہم اشارے کر دو

بگی جلتے ہوئے اور بڑھتے ہوئے شام سے پہلے ہی دیکھ لیتے تھے مقصود کا بند دروازہ کھلنے لگا ہے، مگر میں کھڑا ہوں یہاں، مجھ کو کیا کام ہے، مرا دروازہ کھلتا نہیں ہے، مجھے پھیلے صحرا کی سوئی ہوئی ریگ کا ذرہ ذرہ یہی کہہ رہا ہے کہ ایسے خرابے میں سوکھی ہتھیلی ہے اک ایسا تلوا کہ جس کو کسی خار کی نوک چُبھنے پہ بھی کہہ نہیں سکتی مجھ کو کوئی بوند اپنے لہو کی پلا دو، مگر میں کھڑا ہوں یہاں کس لئے ؟ کام کوئی نہیں ہے تو میں بھی ان آتے ہوئے اور جاتے ہوئے ایک دو، تین —— لاکھوں بگولوں میں مل کر یونہی چلتے چلتے کہیں ڈوب جاتا کہ جیسے یہاں بہتی لہروں میں کشتی ہر اک موج کو تھام لیتی ہے اپنی ہتھیلی کے پھیلے کنول میں، مجھے دھیان آتا نہیں ہے کہ اس راہ میں تو ہر اک جانے والے کے بس میں ہے منزل، میں چل دوں، چلوں —— آئیے آئیے، آپ کیوں اس جگہ ایسے چُپ چاپ، تنہا کھڑے ہیں، اگر آپ کہیے تو ہم اک اچھوتی سی ٹہنی سے دو پھول —— بس بس، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں اک دوست کا راستہ دیکھتا ہوں؛ —— مگر وہ چلا بھی گیا ہے مجھے پھر بھی تسکین آتی نہیں ہے کہ میں ایک صحرا کا باشندہ معلوم ہونے لگا ہوں خود اپنی نظر میں، مجھے اب کوئی بند دروازہ کھلتا نظر آئے۔ یہ بات ممکن نہیں ہے؛ میں اک اور آندھی کا مشتاق ہوں جو مجھے اپنے پردے میں یکسر چھپا لے، مجھے اب یہ محسوس ہونے لگا ہے سہانا سماں جتنا بس میں تھا میرے

وہ سب ایک بہتا سا جھونکا بنا ہے جسے ہاتھ میرے نہیں روک سکتے کہ میری ہتھیلی میں امرت کی بوندیں تو باقی نہیں ہیں، فقط ایک پھیلا ہوا، خشک، بے برگ، بے رنگ صحرا ہے جس میں یہ ممکن نہیں میں کہوں — ایک آیا، گیا، دوسرا آئے گا، رات میری گذر جائے گی۔

سنہ ۱۹۳۴ء

رُخصت

ہاں، یہ مانا کہ بہت دُور تھا لیکن اکثر
سوچتے سوچتے ہی راستہ کٹ جاتا تھا،
شہر کے قرب وجوار
گویا اک آنکھ جھپکتے میں نہاں ہوتے تھے،
سامنے مجھ کو نظر آتا تھا
ایک ویران محل،
یوں ہی بے دھیانی میں چوکھٹ بھی نکل جاتی تھی،
وہی چوکھٹ جسے لاکھوں پاؤں
راہ کے بل ہمیشہ چُھپ کر،
روندتے روندتے اِس حال میں لے آئے تھے،
ٹوٹے دروازے کے سب نقش و نگار
کچھ تو بوسیدہ تھے، اور باقی مری آنکھوں کو
اتفاقاً ہی نظر آئے تھے،
جیسے چلتے ہوئے — رستے میں پھسل کر کوئی

جیسے چلتے راہ پہ کچھ دور نکل آتا ہے
میں بھی دروازے سے چوکھٹ سے گذر جاتا تھا۔
جیسے ساون میں کسی ڈال پہ کوئی گرگٹ
دیکھتے دیکھتے میں رنگ بدل جاتا ہے!
ایک ہی وقت میں، اک لمحے میں،
یونہی ایوان کبھی لیٹا ہوا، بیٹھا ہوا سستا رہا نظر آتا تھا
اونگھتے ہوئے خیمے چپ چاپ ——— آنکھیں اس کی
مجھ کو بے رنگ جھروکوں سے نکلتی ہوئی کرنوں کی طرح
بھولی یادوں سے ملا دیتی تھیں
بھولی بسری ہوئی بیتے ہوئے برسوں کی مانند سی باتوں کو لے آتی ہیں
کبھی للچاتی ہوئی اور کبھی شرماتے ہوئے قلب کو گرماتی ہوئی
آپ ہی آپ میں بہتے ہوئے دھارے کی طرح
اپنے پاؤں کو بڑھا لیتا تھا،
آپ ہی آپ میں رستی ہوئی بوندوں کی طرح
سوچتے سوچتے رک جاتا تھا
آپ ہی آپ ابلتی ہوئی چشمۂ نمناک
یاد کے دامن بوسیدہ سے

خشک ہونے کے لیے پل کو رپٹ جاتی تھی،
آپ ہی آپ میں اڑتے ہوئے طائر کی طرح
بہتے بہتے کسی ٹہنی پہ بسیرا کر کے
جھولتی ٹہنی سے لپٹی ہوئی، پھیلی ہوئی، بے جان زمیں کے اوپر
اپنی ہستی کو گرا دیتا تھا،
اور گرتے ہی نظر آتا تھا

ایک ویران محل،
جس کی چوکھٹ کو مرے ہاتھوں کے ناخن ہر دم
چھیلنے کے لئے بے تاب رہا کرتے ہیں
جیسے یوں چھیلنے سے منظرِ بوسیدہ پر
کچھ نئے نقش ابھر آئیں گے!

اب سمجھتا ہوں کہ یوں بات نہیں بنتی ہے،
آپ ہی آپ کوئی بات کبھی بن بھی سکی؟
آپ ہی آپ کلی کھلتی ہے
اس کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے،
آپ ہی آپ زمیں ہلتی ہے

اُس کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے ،
آپ ہی آپ گھٹا چھاتی ہے
آسماں صاف نظر آتا نہیں
آپ ہی آپ چلی آتی ہے اندھی آندھی
اور پھر منظرِ بوسیدہ اُبھر آتا ہے ،
آپ ہی آپ کوئی بات کبھی بن بھی سکی !
اب سمجھتا ہوں کہ یوں بات نہیں بنتی ہے ،
آپ ہی آپ میں شرمندہ ہوا کرتا ہوں ۔

ریل میں

"گجرات کے ہو؟" — کیا تم سے کہوں، پردیسی کو دھتکارتے ہیں اِس دیس میں
جس کے تم ہو امیں،
انگشت سے خاتم دور ہوئی، کیا تم سے کہوں، اب یہی چمک باقی ہی نہیں اب
ٹوٹ چکا وہ نقشِ حسیں، اوجھل ہے نگاہوں سے وہ نگیں،
پربت سے دھارا بہتی ہے، ویسے ہی بہا ہے نورِ جبیں
دل کا امرت، آنکھوں کا لہو +

یوں رستے ہیں کھل جاتے ہیں، دو رنگ نہیں کچھ جن کو خبر
جب چاند ڈھلے، جب تاروں کا آکاش سے مٹ جائے منظر
کالی راتوں سے بڑھ کے کہیں کالا دن کیسے ہوگا بسر!
تم کہتے ہو، میں گھل بھی چکا، اب آنکھ میں کوئی نہیں ہے اثر،
تم دیکھتے ہو، میں دیکھتا ہوں، دیکھتی ہے یہ میری نظر
جب راہیں تھیں، جب باتیں تھیں، اور ایک ہی دھیان تھا — میں اور تو!

بے کار یہ باتیں کرتے ہیں، کیوں پوچھتے ہیں گجرات کے ہو!
کیا اپنی بات کے دامن سے پونچھیں گے آنکھ کے آنسو کو ؟
جو ہونی تھی وہ ہو بھی چکی، اب چاہے ہنسو چاہے رو لو،
بس یونہی کبھی آجاتی ہے گھلتی گھلتی میٹھی خوشبو!
آنکھوں کی چمک، بازو کی دمک ایسے ہے جیسے دو دریا رواں، باقی ہی نہیں
کچھ اُن کا نشاں
پینگے کا جھولا ٹوٹ گیا، اب سوکھی ہے وہ جوئے رواں
جس میں بہتے بہتے میں نے دیکھا تھا سماں
اُس چاندنی کا جو آتی ہے اور جاتی ہے جیسے سورج کی کرن سے دھندلکا
ہو پنہاں
جیسے جنگل میں پھسلتے پھسلتے پتّوں پر ہو جائے نگاہوں سے اوجھل کوئی آہو!

آخری عورت

ہجوم دائیں بائیں، سامنے دکھائی دے تو مجھ کو ایک پُرشکوہ سیل کا فسانہ یاد آتا ہے ۔
میں بھول جاتا ہوں کہ کون ہوں، میں بھول جاتا ہوں یہ کون ہیں،
میں بھول جاتا ہوں کہ ایک دن تھا ایک رات تھی کبھی۔
میں بھول جاتا ہوں ہوائے شوق نے مجھے
دکھایا تھا وہ جلوہ جس کو دیکھ کر
بس ایک گردشِ نگاہ میں
بدل گیا وہ رنگ بیتے گیت کا،
بدل گیا وہ نقش، خام تھا۔
اُسے ذرا خبر نہ تھی کہ نقش مٹنے پر جب آئے ایک پل میں مٹتا ہے،
بدل گیا سفیدۂ سحر سیاہ رات آگئی،
ستارے چاند ایک ایک کرکے جاگ اُٹھے گہری نیند سے،
چمک نگاہ کی نہ تھی وہ گیسوئے شبانہ ہی کا عکس تھا،
وہ سیمگوں لباس کب تھا سیلِ موجِ نور تھا،
وہ گال پر حیا کی سُرخ لرزشیں نہ تھیں، وہ اک اشارہ تھا

کہ اک حقیقت آج بن کے آئی ہے نظر ــــــ
جو لبِ راہ اک عاجزانہ دھیان ہی کی بات تھی،
کبھی...... کبھی تو سوچ آئی ہوگی، ــــ کیا کبھی نہیں؟
کبھی بھی اک ہجوم دائیں بائیں، سامنے دکھائی دے کے ایک مٹتے نقش کی طرح خم
سکال میں آج تک چھپا نہ تھا،
ہمیشہ چاند بھی، ستارے بھی چمکتے تھے،
ہمیشہ اک سیاہ رات پھیل کر چھپاتی تھی نگاہ سے وہ سیمگوں لباس جس کو سیل
موجِ نور کہہ رہا ہوں میں،
ہمیشہ گال پر حیا کا اک اشارہ اپنے رنگ کو
چھپائے رکھتا تھا ترے گیت ہی کی تان میں،
میں بھول جاتا تھا میں کون ہوں، میں بھول جاتا تھا وہ کون ہے،
میں بھول جاتا تھا کہ ایک دن میں، ایک رات میں
ہوائے شوقِ مجد کو تیرتے ہوئے اسی محل میں لے کے آئے گی
جہاں میں آج منتظر تھا اور نور پر کشادہ سے نکل کے ایسے آگئی
کہ جیسے چاند اور ستارے ایک ایک کر کے جاگ اٹھیں اپنی گہری نیند سے،
بدل کے ہے اب یہ نقش تو، جو خام تو نہیں مگر
اسے بھی کچھ نہیں خبر

کہ نقش مٹنے پہ جب آئے ایک پل میں مٹتا ہے،
سفیدۂ سحر سیاہ رات کو شبانہ گیسوؤں سے دُور کر کے بھول جاتا ہے۔
کوئی ستارہ، کوئی چاند پھر خمِ نگاں سے آئے یہ بات یہ سُنا نہیں۔
سنے ہیں دل نے پُرشکوہ سیل کے فسانے لیکن اُن میں کوئی بات ایسی تھی کبھی۔
یہ مجھ کو یاد ہی نہیں — میں ہوں وہی
جسے ہجوم دائیں بائیں، سامنے دکھائی دے تو ایک پُرشکوہ سیل کا فسانہ یاد آتا ہو۔
ہجوم کب ہے پیرہن کی سلوٹیں ہیں، رفتہ رفتہ یہ بکھر ہی جائیں گی۔
ہجوم کب ہے گال پر حیا کا اک اشارہ اپنے رنگ سے
سجھاتا ہے وہ بات جس کو بھول کر
مجھے سفیدۂ سحر
یہ کہتا ہے کہ پہلا نقش خام تھا، اُسے خبر نہ تھی ذرا
کہ نقش مٹنے پہ جب آئے ایک پل میں مٹتا ہے۔
اُسے خبر نہ تھی ہمیشہ چاند بھی، ستارے بھی یہ چمکتے ہیں
اُسے خبر نہ تھی کہ اک سیاہ رات پھیل کر
وہی محل دکھاتی ہے
جہاں درِ کشادہ سے تو اک ہجوم پیرہن کی سلوٹوں کا، گیسوؤں کا اپنے ساتھ
لے کے ایسے آئی ہے

کہ جیت جاتی نہیں
کہ نقش تو بھی مٹنے پر جب آئے ایک پل میں مٹتا ہے۔
خم ہو کماں، ہم نہ پھر اُس کو روک سکتے ہی نہیں کبھی۔
فقط سفینۂ سحر دریکشادہ بند کرکے چاند کو، ستاروں کو چھپاتا ہے۔

دھوکا

اتھاہ کائنات کے خیال کو غلط سمجھ رہے ہیں ہم ستاروں کی مثال سے،
اتھاہ کائنات اک کنواں نہیں، یہ بحر ہے
ستارے کیا ہیں، کچھ نہیں، یہ جگنوؤں کی طرح اب چمک رہے ہیں، ایک
پل میں ماند ہو کے راکھ بن ہی جائیں گے،
اتھاہ کائنات پھر بھی جیسے اب ہے ویسے ہی دکھائی دیتی جائے گی،
اتھاہ کائنات کون ہیں کہ تم، تمہیں تو ہو،
"تمہیں تو اپنے نیلگوں دوپٹے کو ستاروں سے سجا کے، شب کی تیرگی کو آنکھ سے
چھپا کے آج آئی ہو،
مگر مجھے تو شب کی تیرگی میں لطف آتا ہے اتھاہ کائنات کا،
اتار دو، اتار دو، دوپٹے کو اتار دو، مجھے پسند ہے مگر ابھی نہیں،
ابھی تو رات اپنی ہے، ابھی ہزار بار ایسے لمحے آئیں گے کہ تم
دوپٹے سے اتھاہ کائنات کو چھپاؤ گی،

جو شامیانہ کٹ گیا تو پردۂ درِ سکوں بھی ہٹ گیا،

مگر ہیں پھر بھی سلوٹیں ہی سلوٹیں
لو دیکھو، یہ چاند ایک بھانک بن کے یوں لٹک رہا ہے جیسے اس کو بھید کی خبر
نہیں کوئی۔
مگر تمہیں تو علم ہے، تمہیں سہیلیوں نے کچھ اشاروں میں کہا تو ہوگا۔ ہاں چاؤ،
— ہاں لو،
نہیں! — تو پھر یہ چپ لگی ہوئی ہے کیوں؟
یہ چپ تو مجھ سے کہہ رہی ہے جانتے ہیں، آج ہی کی راہ دیکھتے تھے ہم۔
سمجھ گیا، اتحاد کائنات اک کنواں نہیں، یہ بحر ہے،
ہزاروں بھید اس کی سلوٹوں میں ہیں نہاں مگر
یہ ایسے ہے پڑی ہوئی کہ جیسے کوئی بات جانتی نہیں۔
تو پھر بڑھیں مرے قدم!

بڑھے قدم، مگر یہ کیا، اتحاد کائنات ک کنواں نہیں، یہ بحر ہے،
نگاہ کائنات کے خیال کو غلط سمجھ رہے تھے ہم ستاروں کی مثال سے،
مگر جو سلوٹیں کھلیں تو کھلتی ہی چلی گئیں،
سہیلیوں کا ذکر کیا، سہیلیوں سے پہلے ہی تمہیں ہر ایک بھید کی خبر ہوئی،

تفاوتِ راہ

اُس زمانے میں کہ جنگل تھا یہ باغ
تھے بڑوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ
کھوئے رستوں کا جو اب ویرانی میں کھوجتے ہیں،
ویسے ہی باغ مراجب سے بناتے جنگل
ایک اک لمحہ ستاروں ہی کا ویراں آتا ہے۔
ہر ستارہ مجھ سے جاتا ہے
اُسی چوپال کے بے نام کنارے کی طرف
جس میں بیٹھے ہوئے انسان یونہی بے مصرف
میری ناکامی، ترے نام کی رسوائی سے
تلخ باتوں میں ہر اک رات بسر کرتے ہیں!

بگولا سا کسی کشتی کی طرح سطح پہ اک پل میں اُبھر آتا ہے
آنکھ میں اشک جھلکتے ہیں مگر اشکوں میں
وہ چمن اور وہ مکاں اور وہ روزن تینوں

گُھلتے رنگوں کی دُھن عکس بنا کرتے ہیں
ایک انساں کا جو تقدیر کی بے راہی سے
کبھی مالی کبھی عاشق تھا کبھی دیہاتی
گلّے بانی میں جسے یاد جب آئے ماضی
بنسری اپنی بجاتے ہوئے رو دیتا ہے

جیسے رستے میں کوئی ہاتھ میں دو شمعوں کو
لئے جاتا ہو شبِ ماہ کی طغیانی میں
اور زمیں سینے پہ اک شخص کے اک مہرو کے
تین سایوں سے ڈری جاتی ہو — سہمی سہمی
اس کے ہر اٹھتے قدم کو دل میں
جان کر اپنی رہائی کا ثبوت
یہ سمجھتی ہو ابھی دُور چلا جائے گا۔
اور پھر خوف سے حیران نگاہوں کو فقط
چاند ہی چاند نظر آئے گا،
اس طرح تو نے بھی سوچا ہوگا:
راہرو پاؤں سے جو دھول کے ذرّے مجھ پر

پھینکتے پھینکتے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
انہیں سیندور کی سرخی سے مٹا ڈالوں گی۔
اور پھر دودھ کے دریا میں نہا کر یکسر
سینۂ صاف کی مانند نظر آؤں گی!
گلّے بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ،
راستہ ملتا نہیں مجھ کو ستارے تو نظر آتے ہیں،
پیرہن رنگِ گلِ تازہ سے یاد آتا ہے
اور زرکار نقوش
اک نئی صبحِ حقیقت کا پتا دیتے ہیں،
کبھی ڈھولک کبھی شہنائی کی آواز سنا دیتے ہیں،
زینے کی بھول بھلیاں اسی آواز میں کھو جاتی ہے،
تختہ میں خفا سی ہوئی شمعیں کبھی بجھ جاتی ہیں،
ساتھ کے باغ کی ہر صاف روش بھولا ہوا راستہ بن جاتی ہے،
اور شہنائی پھر اک سانپ نظر آتی ہے،
ڈستی جاتی ہے، کہے جاتی ہے:—
گلّے بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ

کیوں بہن، ہم نے سُنا ہے کہ دلہن کی آنکھیں،
آنکھ بھر کر نہیں دیکھی جاتیں؟

اور کہتی ہے بہن
میرے بھیّا کو بڑا چاؤ ہے، —— کیوں پوچھتا ہے؟
اب تو دو چار ہی دن میں وہ ترے گھر ہوگی ——

کس کا گھر، کس کی دُلہن، کس کی بہن، —— کون کہے
میں کہے دیتا ہوں، میں کہتا ہوں —— میں جانتا ہوں!

جہالت

جنترا بندر کا مداری کے تماشے میں کبھی دیکھا ہے؟
کچھ بناوٹ ہی کہ جس سے ہوتی ہے، کچھ اس کی شرارت کہ جب
منہ چڑھاتے ہوئے رسّی کو یونہی ہاتھ میں بل دے کے ہُمکتے جانا!
ڈگڈگی پر بھی مداری جو بجھا دے تو اچھل کر یکبار
کسی بچّے کی طرف ایسے لپکنا کہ اُسے کاٹ ہی کھائے گا ابھی،
اور پھر بچّے کا بیٹھے ہوئے پیچھے کی طرف گرنا، تماشے میں تماشا، چیخیں،
ہاں، مگر یاد میں یہ چیخیں بہت مزا دیتی ہیں،
دیکھتے دیکھتے ہر بات بُھلا دیتی ہیں
اور اب اپنی جوانی ہے، امڈتا ہوا دریا ہے، کہ بہتی ہوئی دھارا جس کو
بہہ نکلنے سے کوئی روک نہیں سکتا ہے۔
ابھی بل کھاتی، اچھلتی ہوئی لہروں کا تقاضا ہے کہ جب رت آئے،
ہم بھی گھر چھوڑ کے جاتے ہیں کسی باغ کے ویران سے کونے کی طرف،
موجۂ دردِ پریشاں سے کوئی سوکھا سا پتّا گر جائے —
سانجھ کے راستے پر آ بسا اک پَل، اِک گھڑی

چاپ یہ ہم سے کہے — آئے، وہ آئے، آئے
دل کی دھڑکن یہ کہے جاتی ہے — ٹھہرو، سنبھلو،
سوکھا پتا ہے، کوئی اور ہے، — کوئی دم میں
ابھی آجاتے ہیں۔ آتے ہیں — ابھی آتے ہیں
اور ٹہلتے ہیں ذرا مڑکے جو دیکھا تو وہی آپہنچے،
اور پھر یا ہیں ہی باتیں ہیں، — یونہی باتوں میں
چاند چھُپ جاتا ہے اور تارے بھی چھُپ جاتے ہیں،
آنکھوں میں آنکھیں گھُلی جاتی ہیں اور سانس میں سانس —
گال پر ہاتھ جو رکھا تو کنول یاد آیا
ایسا خم — ایسا گداز —
ناک سے ناک لگاتے ہوئے پیشانی پہ پہنچیں جو نگاہیں تو کہا
یہی اب چاند ہے، — تاروں کی ضرورت ہی نہیں
تارے فرقت کی شب تاریں گننے کے لئے ہوتے ہیں،
آج تم بھی تو یہیں ہو، ہم بھی یہیں — گال کا خم
ہم سے کہتا ہے خمِ دورِ زماں ہوں — مجھ کو
دیکھ کر اور کوئی بات نہ یاد آئے گی!

بات یاد آئی — ابھی کل ہی پڑھا تھا تم نے
ڈارون کہتا ہے بندر سے ترقی کر کے
آج انسان بھی انسان بنا بیٹھا ہے
دونوں کے گالوں پہ، جبڑوں پہ ذرا غور کرو
ناک بھی دیکھو — یہ رفتہ رفتہ
اونچی ہوتے ہوئے اس درجہ ابھر آئی ہے
اور پیشانی تو ویسی ہی نظر آتی ہے
یہ نیا آئنے پہ ہر رات کی باتیں مجھ کو
یوں ہنسا جاتی ہیں جیسے وہ لطیفہ ہے کوئی —
یہ لطیفہ — کسی جنگل میں کسی ٹہنی پر
ایک بندر یہ بندریا سے کہا کرتا تھا
آج تم بھی ہو یہیں، ہم بھی یہیں، کل کا غم
ہم سے کہتا ہے غمِ دورِ زماں ہوں — مجھ کو
دیکھ کر اور کوئی بات نہ یاد آئے گی

آدرش

مکان اور مکیں سے دور ایک ایسا باغ ہے

ہر اک روش سجی ہوئی دلہن بنی یہ سوچتی ہے راہرو اب آئے گا

اب آئے گا اب آئے گا، وہ آگیا، نہیں، — یہ اک خیال ایک خواب تھا، دبا ہوا

شگافِ کوہ میں جو ایک چشمہ سو رہا تھا — آنکھ کھل گئی — ابل پڑا،

مگر چمن تو پرسکوں فضا کو گود میں لیے یہ کہہ رہا ہے دل کی دھڑکنیں شمار کیجیے

فضا یہ کہہ رہی ہے دل کی دھڑکنوں کو بھول کے

جو چیز آنکھ دیکھ لے اسی کو پیار کیجیے،

ہر اک صدا، ہر ایک رنگ بے خودی کے بوجھ سے زباں ہلا کے اپنی اپنی بات کہتا جا رہا ہے

کہیں تو رنگ ابھر رہا ہے، کہیں صدا لرز رہی ہے،

کوئی کلی کھلی ہوئی، کوئی سمٹ کے پتیوں کی گود میں چھپی ہوئی،

کہیں روش کا خم اچانک ایک ایسے منظرِ نہاں کو گدگداتا ہے

جو اک تڑپ کے ساتھ کھلکھلا کے یوں نگاہوں کو لبھاتا ہے

کہ اس کو دیکھتے ہی ایک رات کا فسانہ یاد آتا ہے،

دیکھنا! — وہ دیکھی رات اب تو کنجِ داستاں سے نکل کے سامنے ہی آ گئی

یہ اک ہجوم نرم بازوؤں کا گرم گیسوؤں کے سائے لے کے آیا ہے
صدائے ساز کوئی بھی نہیں مگر یہ ناچ ایسے ہے کہ جیسے کُنجِ باغ جھوم اٹھے یک بیک!

کبھی کسی نے دیکھا ہے کہ برشگال میں
ہر ایک قطرہ ابر سے ٹپکتا ہے
پر اپنے آپ اس کو اپنے سینے میں سموتی ہے
مگر یہ کوئی سوچتا نہیں کہ لوگ جلترنگ کس طرح بجاتے ہیں،
ٹپکتے آنسوؤں کو کوئی دیکھتا نہیں ہے! — ایک ایک کرکے گرتے ہیں
جو دامن اب دھوئیں کی طرح مٹ چکا ہے، دھول بن کے سینۂ زمیں پہ
سو رہا ہے، بوند بوند اس میں جذب ہوتی ہے،
کوئی بھی سوچتا نہیں صدائے آبِ دل نے کیا کہا،
ہر ایک اپنے اپنے ساز کی صدا میں محو ہو کے جھوم اٹھتا ہے،
ہر ایک اپنے اپنے دل میں یہ سمجھتا ہے کہ ساز ہے تو ایک ساز ہے ہمارا!
ساز اور ساز کوئی بھی نہیں کہیں
مگر جب ایک پل میں بازوؤں سے گیسوؤں کے سائے ڈھل کے تھم گئے
تو آنکھ دیکھتی ہے اور دل میں دھیان آتا ہے
یہ کُنجِ باغ خندہ گر ہے آرزوئے خواب کا،

اور اس کے آگے ایک تپتی ہوئی سونی مسنت جھیل کے کنارے پر کھڑا
ہے ایک پیڑ جس کی ایک ایک سانس سوچتی ہے ناؤ لوٹ آئے گی،
مگر وہ ناؤ لوٹتی نہیں ہے، دوسرے کنارے پر وہ دور سے دکھائی دیتی جاتی ہے،
بطیں یہاں تو تیرتی ہیں ان کے پر چھٹتے ہیں،
برس کے بوند بوند ان پیڑوں پہ گرتی ہے جھیل کے ساتھ کے کنول پہ جاتی ہے۔
اور اک صدا تڑپ کے ایک تیر کی طرح نکل کے آتی ہے
اور اس کی گونج پے بہ پے سنائی دیتی جاتی ہے
کہاں چلی گئی! — یہی صدا — کہاں چلی گئی؟

مکان مٹ چکا کہیں بھی رفتہ رفتہ گھلتے گھلتے ایک روز مٹ کے کھو ہی جائے گا،
زمین بھی یہی چھپی رہے، کوئی بھی راہرو نہ آئے گا

بس اب تو ایک اجنبی ہجوم سامنے ہے، اور میں ہوں، اور کوئی بھی نہیں،
وہ باغ اک خرابہ ہے کہ جس میں جھیل کے جزیرے پر محل دکھائی دیتا تھا،
محل کہاں بس اب تو چند چوکھٹیں، شکستہ فرش کہہ رہا ہے — ہم بھی تھے
ہر ایک شے کو شب کی تیرگی نے اپنی گود میں چھپا لیا ہے
اندھیری رات گنگناتی بھی لگی ہے اب وہ چاہتی ہے مجھ کو مجھ سے چھین لے،

یہاں دیکھتا ہوں نیرنگی کی لہر لہر رنگتی سمت سمت کے کھیلتی ہوئی مری ہی سمت
آتی ہے

سیاہی اپنے دل میں ایک بھید کو چھپاتی ہے
ہر ایک لہر رفتہ رفتہ گھٹتے ایک دھندلی شکل بنتی جاتی ہے
اور ایک پل میں، دائیں بھوت، بائیں بھوت، سامنے چڑیل ناچتی دکھائی دیتی
ہے۔
چڑیل کب ہے اک صدا ہے ___ تلخ، مرد، بے رُخی کے بوجھ سے دبی ہوئی
گھُٹی ہوئی، کسی کراہتے مریض کی صدا،
یہی صدا اور اس کی گونج پے بہ پے سنائی دیتی جاتی ہے
کہاں چلی گئی، وہ اب کہاں چلی گئی، ___ یہی صدا ___ کہاں چلی گئی!

کتھک!

دیوار پہ نقش مصور کے یا سنگتراش کی کاریگری
یا سنرخ لباس سجائے ہوئے موہن چنچل شیشے کی پری
یا بن کے پرانے مندر میں بولے جو پجاری ہری ہری
اس کے دل کی دیوداسی اک اور ہی روپ میں ناچتی ہے
اب داہیں جھکو، اب بائیں جھکو، یوں، ٹھیک، یونہی، ایسے ایسے!

کیوں چھوڑ سنگھاسن راجا نے بن باس لیا، کیا بات ہوئی
کب سکھ کا سورج ڈوب گیا، کب شام آئی کب رات ہوئی
ساون کی رم جھم گونج اٹھی — بادل چھائے، برسات ہوئی
اب تو کہاں، پرجا پیاسی اک اور ہی روپ میں ناچتی ہے
اب داہیں جھکو، اب بائیں جھکو، یوں، ٹھیک، یونہی، ایسے ایسے!

کوئی گیت سنے کوئی ناچ پر اپنے سر کو دھنے — دیوانہ ہے
مٹ جائے دھندلکا، دھیان آئے، یہ گیت، یہ ناچ بہانہ ہے!

سارے گاما پادھا نی بھید ہے، بھید مگر یہ فسانہ ہے
اس بھید کو بوجھ تھکے گیانی — اب ندی بہتی جاتی ہے
کبھی دائیں گئی، کبھی بائیں گئی، کبھی لوٹ کے پھر سے بڑھی آگے!

تُو کون ہے، بول بتا تیرا کیا نام ہے، دیس کہاں تیرا؟
کیا ایک چھلاوا ہے! کھو جائے تو پائیں کیسے نشاں تیرا
ہم ایک زمان و مکاں کے ہیں اور تو — ہر ایک جہاں تیرا!
تیری آواز تو الجھاتی ہے گونج کے کہتی جاتی ہے
جو جاگ رہے تھے سو بھی چلے، جو سوئے تھے چونک اُٹھے، جاگے!!

حرامی

قدرت کے پرانے بھیدوں میں جو بھید چھپائے چھپ نہ سکے
اُس بھید کی تو رکھوالی ہے:
اپنے جیون کے سہارے کو اِس جگ میں اپنا کر نہ سکی،
یہ کم ہے کوئی دن آئے گا — وہ نقش بنانے والی ہے
جو پیت پھول ہے کیاری کا، پھر پھلواری ہے — بالی ہے
نچروں کے بنائے بن نہ سکے، اپنوں کے مٹائے مٹ نہ سکے
جو بھید چھپائے چھپ نہ سکے اُس بھید کی تو رکھوالی ہے

یہ سُکھ ہے، دُکھ کا گیت نہیں، کوئی ہار نہیں کوئی جیت نہیں،
جب گود بھری تو مانگ بھری، جیون کی کھیتی ہو گی ہری،
جو جنتے ریت کی بات کہے، ہم پیت ہی کے متوالے ہیں۔

کوئی ناچ ناچ کر تھکتا ہے، کوئی سُکھ میں مگن ہو جاتا ہے،
کوئی دکھ سے لوٹ کر بڑھتا ہے، کوئی دور سے بیٹھا تکتا ہے،

جو جیسے ریت کی بات کہے، ہم پیت ہی کے متوالے ہیں،

آکاش پہ لاکھوں بادل ہیں کچھ اُجلے، کچھ مٹیالے ہیں
سب روپ بڑھانے والے ہیں، سب دل گرمانے والے ہیں
کچھ لال اُبلتے سورج سے، کچھ پیلے چاند کی سج دھج سے
کچھ کاجل جیسی کالی کالی رجنی کے اندھیاروں سے
کچھ دور چمکتے تاروں سے — آکاش کا روپ نکھرتا ہے،
جو پل آتا ہے سنورتا ہے اور دل پہ جادو کرتا ہے
یہ سورج چاند ستارے سارے اجالے سارے اندھیارے

قدرت کے پرانے بھیدی ہیں
جو جیسے ریت کی بات کہے یہ پریت کا گیت سناتے ہیں،
ہنستے ہیں، ہنستے جاتے ہیں جو روتے اس کو ہنساتے ہیں،
ہر ایک کرن سے پھوٹتا ہے وہ نور — وہ بھید جو چھپ نہ سکا
اس بھید کی تُو رکھوالی ہے۔

فنا

ہاں تمنا ارادہ تو بنتی تھی، لیکن یونہی اک کلی جیسے پھول،
وہ کسی لہر کی طرح دل سے مچل کر نکلتی تھی دو بول بن کر کبھی،
اور یہ آپ تو جانتے ہیں کلی کھل کے جب پھول بن جائے گی،
پھر کلی ہی رہے گی، رہے گا نہ پھول،

باغ کوئی نہ تھا، کوئی صحرا نہ تھا، کوئی پربت نہ تھا، کچھ نہ تھا
ایک ساگر ہی ساگر جدھر دیکھیے، موجزن موجزن، آگے بڑھتا ہوا،
کوئی ساحل نہ تھا، کوئی منزل نہ تھی، سوچیے آگے بڑھ کر وہ رکتا کہاں
دھیان بھٹکا تڑپ کر — یونہی سامنے روپ کی ناؤ اک چھوڑ دی
دیکھتے ہی تھا، آگے بڑھتا ہوا — موجزن — اب تو کوئی نہ تھا
باغ کوئی نہ تھا، کوئی صحرا نہ تھا، کوئی پربت نہ تھا، کچھ نہ تھا،
باغ میں پھول کے کھلنے کا نشا ہوا — سوچ اس کی تو آئے، یہ ممکن نہیں،
اور صحرا میں تو پیاس مٹتی نہیں، اور بڑھتی ہے — یہ بھی تو ممکن نہ تھا،
کوئی پربت جو آجائے پاؤں تلے، دھیان کی موج میں چلنے والا پھسل کر گرے — یہ بھی ممکن نہ تھا،

اور جو کچھ بھی نہ ہو، پھر تو اندیشہ کوئی بھی بھولے سے آئے — یہ ممکن نہیں،
پہلے کہہ تو دیا باغ کوئی نہ تھا، کوئی صحرا نہ تھا، کوئی پربت نہ تھا،
پوچھتے ہو کہ پھر کیوں جھجکتے ہوئے، آگے بڑھتا ہوا موجزن بحر سمٹا، سمٹ ہی گیا،
پہلے کہہ تو دیا — اک کلی کھل کے جب پھول بننے لگی،
پہلی رُت کھو گئی — تم سمجھتے ہو آئی نئی،
یہ نئی بھی نئی کب ہے اس کو بھی جانو — گئی ہی گئی،
آنے والا یہ کہتا ہے میں جاؤں گا، دیکھنے والا اس کو سمجھتا نہیں،
دیکھنے سے اگر اس کو فرصت ملے، دیکھنا چھوڑ دے، بات سُننے لگے
سُن کے وہ جان لے اور اُس کی تمنا ارادہ تو بننے نہ پائے کبھی،
وہ کسی لہر کی طرح دل سے نکل کر نہ جائے کبھی،
پھر کلی بھی کلی ہی رہے، اور ساگر بہے، آگے بڑھتا ہوا — موجزن، موجزن،
باغ کوئی نہ ہو اس کی پروا نہیں،
کوئی صحرا نہ ہو اس کی پروا نہیں،
کوئی پربت نہ ہو اس کی پروا نہیں،
خواہ کچھ بھی نہ ہو اس کی پروا نہیں،
اک تمنا تو ہے، اک اچھوتی کلی،
یہ کلی تو کلی ہی رہے گی، اسے دھیان کچھ بھی کہے،

اس ٹکی کو کبھی سوچ آئی نہیں، کون آیا — گیا،
اس ٹکی کو کبھی سوچ آئی نہیں کس نے کیا کچھ کب،
یہ ٹکی ہے گگن بیچ پڑی دُلہن کی طرح
دیکھتی نہیں، اس کو معلوم ہے — سب کا آنے و جانا،
شام سے صبح اس نے سجائی ہے لیکن اسے رات کا دھیان کوئی نہیں،
ایک ہیں اس کو دن رات، شام و سحر ایک ہیں سال، صدیاں سبھی ایک ہیں،
اس ٹکی کو کبھی سوچ آئی نہیں کون آیا — گیا،
یہ ٹکی ہے گگن بیچ، ایک دُھن کی طرح،
یہ دُھن — اک دُھن! — اور ساگر کہاں ہے جو تھا موجزن؟
کوئی ساگر نہیں، باغ — صحرا نہیں، کوئی پربت نہیں
اور کچھ بھی نہیں ——!

رس کی انوکھی لہریں

میں یہ چاہتی ہوں کہ دنیا کی آنکھیں مجھے کبھی یوں ہی یوں دیکھتی جائیں جیسے
کوئی پیڑ کی نرم ٹہنی کو دیکھے،
لچکتی ہوئی نرم ٹہنی کو دیکھے،
مگر یوں جیسے پتوں کا اترے ہوئے پیرہن کی طرح سبزے کے سائے ہی فرش پر ایک مسلا ہوا
ڈھیر بن کر پڑا ہو،
میں یہ چاہتی ہوں کہ جھونکے ہوا کے لپٹتے چلے جائیں مجھ سے،
مچلتے ہوئے، چھیڑ کرتے ہوئے، ہنستے ہنستے کوئی بات کہتے ہوئے، لاج کے بوجھ
سے رکتے رکتے، سنبھلتے ہوئے، رس کی باتیں سرگوشیوں میں،
میں یہ چاہتی ہوں کہ میں چلتے چلتے کبھی دوڑتے دوڑتے بڑھتی جاؤں ہوا ــ
ہوا جیسے ندی کی لہروں سے چھوتے ہوئے مسکراتے ہوئے بہتی جاتی ہے، رکتی
نہیں ہے،
اگر کوئی پنچھی سہانی صدا میں کہیں گیت گائے
تو آواز کی گرم لہریں مرے جسم سے آکے ٹکرائیں اور لوٹ جائیں، ٹھہرنے نہ پائیں،
کبھی گرم کرنیں، کبھی نرم جھونکے،

کبھی میٹھی میٹھی فسوں ساز باتیں ،
کبھی کچھ کبھی کچھ نئے سے نیا رنگ ابھرے ،
ابھرتے ہی تحلیل ہو جائے جیسی فضائیں ،
کوئی چیز میرے مسرت کے گھیرے میں رکنے نہ پائے ،

مسرت کا گھیرا سمٹتا چلا جا رہا ہے
کھلا کھیت گندم کا پھیلا ہوا ہے
بہت دور آکاش کا شامیانہ انوکھی مسہری بنائے رسیلے اشاروں سے بہکا
رہا ہے ،
تھپیڑوں سے پانی کی آواز پنچھی کے گیتوں میں گھل کر پھسلتے ہوئے ب نگاہوں سے
اوجھل ہوئی جا رہی ہے۔
میں بیٹھی ہوئی ہوں
دوپٹہ میرے سر سے ڈھلکا ہوا ہے
مجھے دھیان آتا نہیں ہے مرے گیسوؤں کو کوئی دیکھ لے گا ،
مسرت کا گھیرا سمٹتا چلا جا رہا ہے ،
بس اب اور کوئی نئی چیز میرے مسرت کے گھیرے میں آنے نہ پائے ،

ایک تھی عورت

یہ جی چاہتا ہے کہ تم ایک ننھی سی لڑکی ہو اور ہم تمہیں گود میں لے کے اپنی بٹھالیں،
یونہی چیخو چلاؤ، ہنس دو، یونہی ہاتھ اٹھاؤ ہوا میں ہلاؤ، ہلا کر گرا دو،
کبھی ایسے جیسے کوئی بات کہنے لگی ہو،
کبھی ایسے جیسے نہ بولیں گے تم سے،
کبھی مسکراتے ہوئے شور کرتے ہوئے پھر گلے سے لپٹ کر کرو ایسی باتیں
ہمیں سرسراتی ہوا یاد آئے۔
جو انجان پیڑوں کی شاخوں سے ٹکرائے دل کو انوکھی پہیلی بجھائے مگر وہ پہیلی سمجھ
میں نہ آئے،
کوئی سرد چشمہ اُبلتا ہوا اور مچلتا ہوا یاد آئے
جو ہو دیکھنے میں ٹپکتی ہوئی چند بوندیں
مگر اپنی حد سے بڑھے تو بنے ایک ندی بنے ایک دریا، بنے ایک ساگر،
یہ جی چاہتا ہے کہ ہم ایسے ساگر کی لہروں پہ ایسی ہوا سے بہائیں وہ کشتی جو بہتی نہیں ہے
مسافر کو لیکن بہاتی چلی جاتی ہے، اور پلٹ کر نہیں آتی ہے، ایک گہرے سکوں
سے ملاتی چلی جاتی ہے۔

یہ جی چاہتا ہے کہ ہم تُم یونہی جنگلوں میں پھیلائیں ہنس دیں، یونہی ہاتھ اٹھائیں،
ہوا ہیں ہلائیں، بڑھ کر گرا دیں،
کبھی ایسے جیسے کوئی بات کہنے لگے ہیں
کبھی ایسے جیسے نہ بولیں گے تم سے،
مگر تم ہمیں گود میں لے کے اپنی بٹھا لو،
مچلنے لگیں تو سنبھالو۔
کبھی مسکراتے ہوئے شور کرنے، وِشَپَّر گلے سے لپٹ کر کریں ایسی باتیں
تمہیں سرسراتی ہوا یاد آئے
وہی سرسراتی ہوا جس کے میٹھے فسوں سے دوپٹہ پھسل جاتا ہے
وہی سرسراتی ہوا جو ہر انجان عورت کے بکھرے ہوئے گیسوؤں کو
کسی سوئے جنگل پہ گھنگھور کالی گھٹا کا نیا بھیس دے کر
جگا دیتی ہے:

تمہیں سرسراتی ہوا یاد آئے
ہمیں سرسراتی ہوا یاد آئے
یہ جی چاہتا ہے،
مگر اپنی حد سے بڑھے تو ہر اک شے   بنے ایک ندی، بنے ایک دریا، بنے ایک ساگر

وہ ساگر جو بہتے مسافر کو آگے بہاتا نہیں ہے جھکولے دیئے جاتا ہے، بس
جھکولے دیئے جاتا ہے،
اور ہر جی ہی جی میں مسافر یہ کہتا ہے اُپنی کہانی نئی تو نہیں ہے۔
پرانی کہانی میں کیا لطف آئے،
ہمیں آج کس نے کہا تھا — پُرانی کہانی سناؤ۔

کروٹیں

اجنبی آرزو دل میں آنے لگی
پھر سے لانے لگی اپنے ننھے کے بل پر وہی موہنی
جس نے پابند کر کے دکھایا نہ تھا
ایک ہی راہ میں اور بھی راستے جو نئے سے نئے ہوں چلے آتے ہیں
دیکھ لے آنکھ گر بیٹ کے اک پل کو پہلو کے منظر کی باتوں کا جلوہ جسے
سوئے رہنا ہے یونہی اچھوتی، کنواری دُلھن کی طرح
جب تک آئے نہ بن کر کوئی سورما، بانکا ترچھا جواں،
اپنے گھوڑے کی باگوں کو تھامے ہوئے،
تھامتے تھامتے

دھیرے دھیرے د. بڑھتا تو جائے مگر
سامنے ہی جمی ہو نہ اس کی نظر،
ایک پل کے لئے اپنے پہلو کی باتوں کے جلوے کو بھی دیکھ لے :
کوئی ہنستا نہ ہو، کوئی روتا نہ ہو،
اس کے پہلے، پرانے جنم کے سبھاؤ پہ ہنستا نہ ہو،

اُس کے انجان، اک رنگ والے پہاڑ پہ، — اُس کو جو آگے لگے گا اُسی
گھاٹ پہ کوئی روتا نہ ہو،
اور بیلہ کا منتظر دُلھن کی طرح سیج پر راہ تکتے ہوئے،
راہ تکنے سے تھکتے ہوئے،
یونہی سو جائے دل میں کسی تان کی گونج کو تھامتے تھامتے،
جس میں کھویا ہوا ہو رسیلی فضا کا سہانا مزہ،
وہ مزہ جس نے پابند کر کے دکھایا نہ تھا
ایک ہی راہ میں اور بھی راستے ہیں نئے سے نئے
جیسے نغمہ کوئی
اپنے پہلو میں لے کر کئی — سُر کے رنگین مبہم اشارے پھسلتے ہوئے،
اور مچلتے ہوئے اور اُبلتے ہوئے، گرتے بڑھتے ہوئے،
بہتا جاتا ہے جیسے کہیں
دُور — صحرا کے ذرّوں کو موجیں ہوا کی اٹھا کر بہاتے ہوئے۔
لے کے پہنچائیں پورب سے پچھم کے در تک مگر
سوچ اِس کی تو اب آئی ہے
آج تک سونے رستے پہ چلتے ہوئے
آنکھ کو بھول کر دھیان آیا نہیں تھا کہ اس راہ میں

دائیں بائیں کئی ایسے منظر پڑے ہیں جنہیں
سوئے رہنا ہے یونہی اچھوتی، کنواری دلہن کی طرح
جس نے آنچل سے آگے نہ دیکھا کبھی
رنگ کی لہر میں کیسے ذرّے چھُپے ہیں جو اک پل میں بیتاب ہو جائیں گے
اور کہہ دیں گے ہم نے تمہارے لئے آج تک غیر کو آنکھ بھر کر نہ دیکھا کبھی
بھول کر جا پڑی بھی جو اپنی نظر سرسراتے ہوئے اور پھسلتے ہوئے
سرسری طور پہ دیکھ کر لوٹ آئی اُسے دھیان آیا یہی
اِس سے ملتی ہوئی لیکن اِس سے کہیں بڑھ کے کِھلتی ہوئی
اک کلی راستہ دیکھتی ہے اُسے چل کے سینے سے اپنے لگا لے کہ تو
اور وہ —— دونوں اک دوسرے کے لئے ہی بنائے گئے ہیں، مگر
میٹھی باتوں کے نیچے جو پاتال ہے
اُس کی گہرائی سے ایک زہریلی ناگن اُبھر آئے گی
رینگتے رینگتے، اپنی پھنکار سے صاف کہہ دے گی چاہو تو مانو اسے
لیکن اِس کی ہر اک بات میں جھوٹ ہے یوں سمویا ہوا
جیسے بادل کے گھونگٹ میں کھویا ہوا
چاند کا روپ چھُپتی ہوئی تان کے بھیس میں
پھوٹ پڑتا ہے چشمے کی مانند لیکن بجھاتا نہیں پیاس کو

اور بھڑکا کے بے چین کرتا چلا جاتا ہے ،
رات سو جائے گی
اور سویرا اُبلتے ہوئے نُور کو اپنے پہلو میں لے کر نظر آئے گا
سوچ جاگے گی اور سیج کے پھول کانٹے بنیں گے سبھی
رنگ کے گیت میں سارے مہمل اشارے ہی رہ جائیں گے
ایک تنکے کی مانند بہہ جائیں گے بول سب پریت کے ،
دھیان آئے گا دل میں کہ اب تو یونہی سوچتے سوچتے ،
کھوئے کھوئے ہمیں اک اچھوتی ، کنواری دُلھن کی طرح
بیٹھے رہنا ہے رستے کو تکتے ہوئے ،
جب تک آئے نہ بن کر کوئی سوریا ، بانکا ترچھا جوان
اپنے گھوڑے کی باگوں کو تھامے ہوئے ۔

برقع

آنکھ کے دشمن جاں پیراہن
آنکھ میں شعلے لپکتے ہیں، جلا سکتے نہیں ہیں اِن کو
آنکھ اب چھپ کے ہی بدلہ لے گی
نئی صورت میں بدل جائے گی،

جسم، تپتے ہوئے ملبوس لرزتی ہوئی کرنوں کی طرح سب یوں ہی کھو
جائیں گے،
اور نظر آئے گی اک آنکھ کی تصویر پسِ بے نام،
آنکھ بھی کب تک اُسے پھول کنول کا کہیے
دیکھنے ہی سے جسے بات نہیں بنتی ہے،

جب نگاہوں سے لگا دیں تو پلٹ جائیں
کون کہہ سکتا ہے دل بھی کھل جائیں
ایک ہی بات کا آتا ہے یقیں
آنکھ کے دشمن جاں پیراہن

دل کے رستے میں کوئی روک نہیں لاسکتے
آنکھ میں شعلے لپکتے ہوئے رہ جاتے ہیں،
دل میں جو آگ سلگتی ہے اُسے آنکھ بجھ دیتی ہے
دل کے شعلوں کو مٹا دیتی ہے
اپنے آغوش میں لے لیتی ہے،
وہی آغوش جو اک غنچے کی مانند نظر آتا ہے
وہی غنچہ جو کسی گلشنِ شب رنگ کے دامن میں چُھپا بیٹھا ہو،
پیڑ کی ایک لچکتی ہوئی ٹہنی کو ہوا کا جھونکا
اپنی لہروں سے ہلاتے ہوئے چل دیتا ہے
اور پھر شاخ بھی بن جاتی ہے اک لہر، مجسّم خوشبو،
وہی خوشبو جسے ملبوس چُھپاتے ہیں نگاہوں سے، دکھاتے ہی نہیں،
وہی ملبوس، وہی آنکھ کے دشمن ہر دم
سامنے جھولتے رہتے ہیں، — جھکولوں سے مدام
دل میں جو آگ سُلگتی ہے اُسے اور بڑھا دیتے ہیں،
آنکھ میں شعلے لپکتے ہوئے رہ جاتے ہیں،
آنکھ بھی کب ہے اُسے پھول کنول کا کہیئے!

پھول توسخ کے دامن میں لگا رہتا ہے،
اور آوارہ ہوا کا جھونکا
بہتا چلا جاتا ہے، — یونہی بہتا ہے
پیڑ کی ایک لچکتی ہوئی ٹہنی کو ہلا سکتا نہیں،
سائے میں بیٹھے ہوئے غمزدہ راہی کے لئے پھل کو گرا سکتا نہیں،
آنکھ کے دشمن جاں پیراہن،
شاخ کے پتے، — یہ، سبز نقاب
اپنے ہاتھوں میں لئے رہتے ہیں
اُسی گوہر کو جسے دیکھ کے آنکھیں دل سے
وہی اک بات کہیں، رات کی بات،
جو بھڑکتے ہوئے شعلوں کو مٹا دیتی ہے
دل میں سوئی ہوئی نفرت کو جگا دیتی ہے،
اور چپکے سے یہ آسودہ خیال آتا ہے
آج تو بدلا لیا ہم نے نگاہوں سے چھپے رہنے کا،
آج تو آنکھ — اُسی پھول کو دیکھا ہم نے
جسے پتوں کا نقاب
اپنے ہاتھوں میں لئے رہتا تھا!

(۲)

پہلے پھیلی ہوئی دھرتی پہ کوئی چیز نہ تھی
صرف دو پیڑ کھڑے تھے — چپ چاپ
اُن کی شاخوں پہ کوئی پتے نہ تھے
اُن کو معلوم نہ تھا کیا ہے خزاں کیا ہے بہار،
پیڑ نے پیڑ کو جب دیکھا تو پتے پھوٹے
وہی پتے — وہی بڑھتے ہوئے ہاتھوں کے نشاں
شرم سے بڑھتے ہوئے، گو ہر ناپاں کو چھپاتے ہوئے، سہلاتے ہوئے،
وقت بہتا گیا، جنت کا تصور بھی لڑھکتے ہوئے پتھر کی طرح
دور ہوتا گیا، دھندلاتا گیا،
پتے بڑھتے ہی گئے، بڑھتے، بڑھتے گئے،
نت نئی شکل بدلتے ہوئے، کروٹ لیتے
آج ملبوس کی صورت میں نظر آتے ہیں،
آج تو آنکھ کے دشمن ہیں تمام،
آنکھ اب چھپ کے ہی بدلے گی،
جھلملاتے ہوئے پتے تو لرزتی ہوئی کرنوں کی طرح سایوں میں کھو جائیں گے۔

اور بھڑکتے ہوئے شعلے بھی لپکتے ہوئے سو جائیں گے،
دل میں سوئی ہوئی نفرت سگِ آوارہ کی مانند اندھیرے میں پکار
اٹھے گی:۔
ہم نہ اب آپ کو سونے دیں گے۔
اور چپکے سے یہ آسودہ خیال آئے گا
آج تو بدلا لیا ہم نے نگاہوں سے چھپے رہنے کا۔
لیکن اب آنکھ بھی بدلے گی۔
نئی صورت میں بدل جائے گی۔

۱۹۴۳ء

تن آسانی

غسل خانے میں وہ کہتی ہیں ہمیں چینی کی اینٹیں ہی پسند آتی ہیں
چینی کی اینٹوں پہ وہ کہتی ہیں چھینٹا جو پڑے تو پل میں
ایک اک بوند بہت جلد پھسل جاتی ہے۔
کوئی پوچھے کہ بھلا بوندوں کے یوں جلد پھسل جانے میں
کیا فائدہ ہے۔
جب ضرورت ہوئی جی چاہا تو چپکے سے گئے اور نہا کر لوٹے
دھل دھلا کر یوں چلے آئے کہ جس طرح کسی جھیل کے پانی پہ کوئی
مرغابی
ایک دم ڈبکی لگاتی ہے لگاتے ہی ابھر آتی ہے
اور پھر تیرتی جاتی ہے ذرا رکتی نہیں

وہ یہ کہتی ہیں مگر چینی کی اینٹوں کا اگر فرش ہو دیواریں ہوں
دل یہ کہتا ہے کہ ہر چیز کا نکھرا ہوا رنگ
آنکھوں کو کتنا بھلا لگتا ہے۔

جیسے برسات میں تھم جاتے ہیں بادل جو برس کر تو ہر اک پھلواری
یوں نظر آتی ہے
جیسے جانا ہو اُسے اپنے کسی چاہنے والے سے کہیں ملنے کو جانا
ہو مگر
ابھی کچھ سوچ رہی ہو
کوئی پوچھے کہ بھلا چینی کی اینٹوں کو کسی سوچ سے کیا نسبت ہے
چینی کی اینٹیں تو بے جان ہیں پھلواری میں ہر پھول کی ہر پتّہ
زیست کے نور سے لہراتا ہے
پھول مرجھائے کلی کھلتی ہے
اور ہر پتہ نئے پھول کے گُن گاتا ہے
چینی کی اینٹیں کوئی گیت نہیں گا سکتیں
چینی کی اینٹیں تو خاموش رہا کرتی ہیں
ایسی خاموشی سے اک کے بہلانے والا
مجھ اس انداز سے اک تان لگاتا ہے کہ لقمان ہی یاد آتا ہے
جب میں یہ کہتا ہوں وہ پوچھتی ہیں
کوئی پوچھے تو بھلا تان کو لقمان سے کیا نسبت ہے
اور میں کہتا ہوں لقمان کو... لقمان کو... یا تان کو... رہنے دو چلو.

اور کوئی بات کریں
اور یوں لیٹے ہی رہتے ہیں کسی کے دل میں
دھیان آتا ہی نہیں
غسل خانے میں قدم رکھیں نہا کر سوئیں۔
لیٹے لیٹے یونہی نیند آتی ہے سو جاتے ہیں۔

اداکار

مری زبان چھپکلی کی مانند پھول سے چھو رہی ہے گویا
گداز پتی کے رس کو اک پل میں چوس لے گی
مگر اسے یہ خبر نہیں ہے ہر ایک پھول ایک — ایک بھنورے کے دھیان
میں کھو کے جھومتا ہے
مجھے جو سرنے پھول کو جو دیکھے
یہی سمجھتا ہے اس کی نکہت مرے فسردہ مشامِ جاں کے لئے بنی ہے
مگر کھلا پھول کس کا تھی ؟

میں اک مسافر — چھتوں پہ دیوار و در پہ دہلیز پر بسیرا رہا ہے میرا
اور آج رستے میں آ گئی تو
یہ تیرا پردہ کہ جس کے اُس پار مجھ کو دیوار و در بھی دہلیز بھی چھتیں بھی
دکھائی دیتی ہیں خاک آلودہ آگہی سے
کبھی تو اٹھتا ہے اٹھ کے گرتا ہے گر کے اٹھتا ہے — اس کی لرزش
کبھی تبسم کبھی سکوں کی پکار بن کر

مجھے بلاتی ہے پھر یہ کہتی ہے چُپ ـــــ ٹھہر جاؤ دیکھو شاید کوئی ہمیں دیکھتا ہے لیکن

کِھلا ہوا پھول کس کا ساتھی

اُسے چمن سے نہیں ہے نسبت وہ اس جہان میں

ہر اک کے ہاتھوں سے ہوتے ہوتے کبھی کسی سیج پر کبھی سیج سے چتا تک

پہنچتا رہتا ہے اولوزمانہ

پکارتا ہے۔ کِھلا ہوا پھول کس کا ساتھی ؟

وہ مٹ کے رہتا ہے مٹ کے رہتا ہے چاہے رستے میں جو بھی آئے اُسے مٹا دے

میں جانتا ہوں کھلا ہوا پھول کس کا ساتھی

میں جانتا ہوں یہ چند اشارے مجھے بھی اس رات سے ملا کر

شکستہ ساحل کی جھاگ بن کر

سکوں کے آغوشِ بے رخی میں ہی جا بسیں گے

وہی سیہ رات جس کے مبہم گلوئے تیرہ کا گرم اندھیرا

اُبلتے دود سیہ کی مانند یہ بتاتا ہے کوئی شے اس جگہ جلی ہے

وہی اُبلتا ہوا اندھیرا ہماری ہستی پہ چھا گیا ہے۔

ہماری ہستی جو ایک تنکے کا روپ بھر کر مچلتی لہروں پہ بہہ رہی ہے
مچلتی لہریں ترا تبسم ترے اشارے ہیں میرے ماضی کی خاک آلودہ آگہی ہے۔
میں جن کے بل پر یہ کہہ رہا ہوں
مری زبان چھپکلی کی مانند پھول سے چھُو کے رس کو اک پل میں چوس لے گی
مگر یہ پردہ جو روک بن کر محل کو گھیرے ہوئے ہے رستے سے کب ہٹے گا؟
یہ کب مسہری بنے گا تیری؟

اچانک اک سمت سے وہ بھنورا پھسل کے آیا
تو میں نے دیکھا خیال کی گود ہی کھلی ہے
کھِلا ہوا پھول کس کا ساتھی!
میں سوچتا ہوں کہ سیمگوں دودِ کہکشاں میں
کئی مسافر بھٹک رہے ہیں۔
مگر سفر کس لئے ہوا کس کو آگے جانا ہے ساتھ پژمردگی کو لے کر
اسے یہاں کون جانتا ہے
ہر اک کے پہلو میں خاک آلودہ آگہی ہے۔
